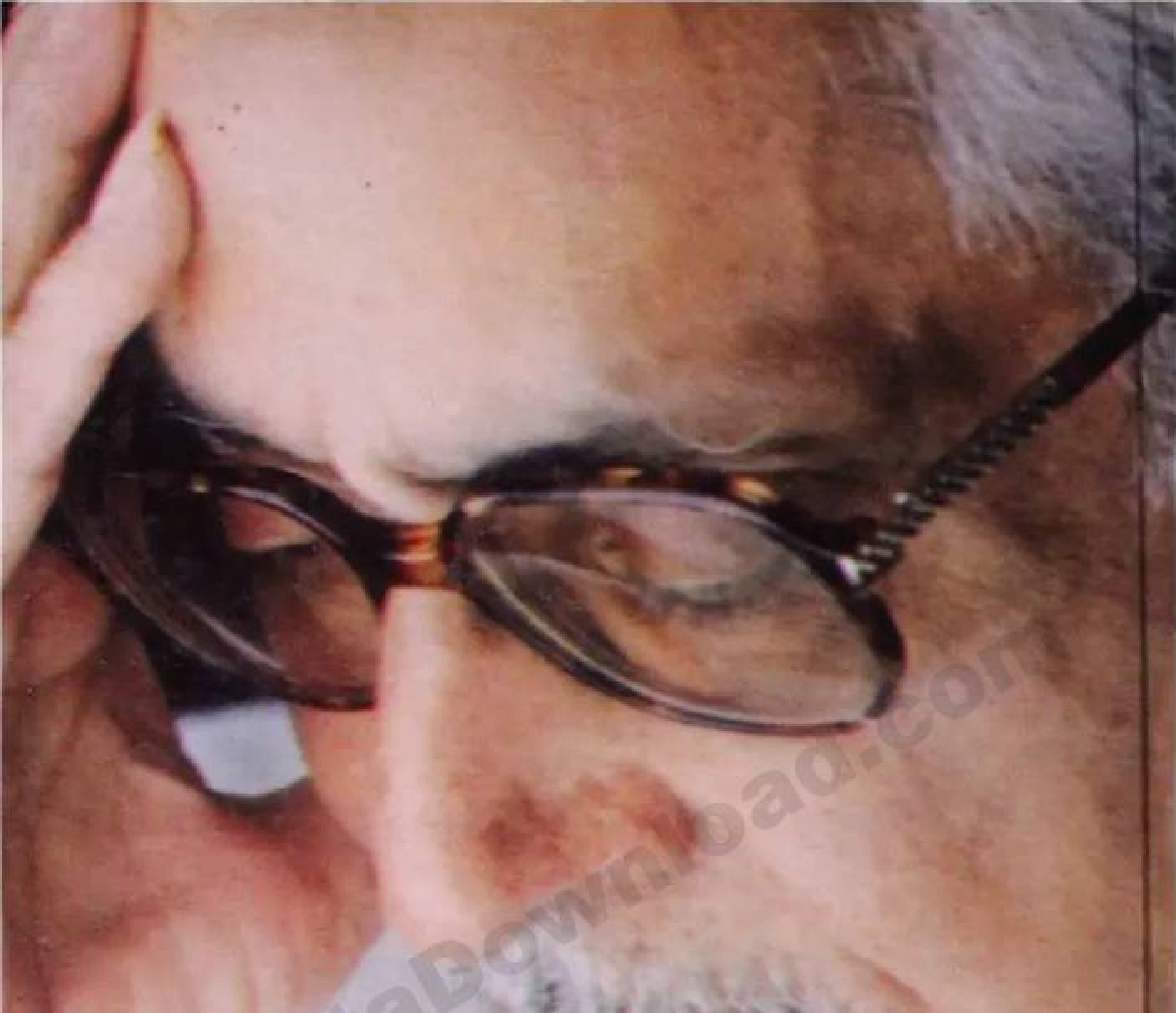

انوکھے سچ

وہ لوگ، واقعات اور علوم جو مجھے دلچسپ لگے یا جنھوں نے مجھے چونکا دیا۔

مظہر سعید قریشی

RekhtaDownload.com

انوکھے سچ

وہ لوگ، واقعات اور علوم جو مجھے دلچسپ لگے یا جنھوں نے مجھے چونکا دیا۔

مظہر سعید قریشی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

RekhtaDownload.com

891.4398 Mazhar Saeed Qureshi
Anokhay Such / Mazhar Saeed
Qureshi. -Lahore : Sang - e - Meel
Publications, 2001.
186p.
1. Urdu Adab. I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/مصنف سے باقاعدہ
تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا اگر اس قسم کی
کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے

RekhtaDownload.com

2001.
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970

کمبائن پرنٹرز، لاہور

ترتیب

یہ "میں" ہوں 9

ممتاز مفتی

ممتاز مفتی کی یاد 15

ممتاز مفتی سے دوستی 19

ممتاز مفتی سے خط کتابت 21

انوکھے عشق اور واقعات

انوکھے عشق 75

چرواہا 76

سرمد شہید 79

بابا بلھے شاہ 84

بوڑھوں کا رومانس 86

اس حسن کو کیا کہیے 91

دینا 94

شاہ صاحب 98

دو رومانس 101

کھوجی 105

اتفاق 109

ہر آن، نئی شان 118

اے۔ آر۔ رحمان 120

پانچ ڈالر میں ایک مہینا 122

قدرت اللہ شہاب کا ایک راز 126

چھوٹا آدمی 128

پروانہ اور بھنورا 132

علم نجوم اور دلچسپ پیشین گوئیاں

جوتش علم نجوم 135

138 Astrology:

Moving Finger Writes

146 Nostra Damis

154 Jeane Dixon

156 Visions, Trance, Dreams

161 Spiritual Predictions

پامسٹری اور میں 163

روحوں کی باتیں

روحیں 175

ایک جرمن سرجن کی روح 179

علامہ اقبالؒ سے مرزا غالب اور مولانا روم کی ملاقات 183

184 Mediums

روحوں کی باتوں کی حقیقت 186

☆☆☆

RekhtaDownload.com

اس کتاب کے لیے احمد بشیر کیا کہتے ہیں

مجھ سے کسی نے پوچھا کہ تم نے ساری عمر لکھنے پڑھنے میں ضائع کر دی، یہ بتاؤ کہ بڑا رائٹر کون ہوتا ہے؟ سوال مشکل تھا، مگر میں نے کہا کہ بڑا رائٹر وہ ہے جو اپنی کتاب پڑھوا سکے۔ یعنی قاری اسے پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔

یہ بات یہاں برموقع ہے، کیونکہ جب میں نے مظہر سعید کی کتاب ''انوکھے سچ'' شروع کی تو اسے ختم کیے بغیر چھوڑ نہ سکا۔

مظہر سعید ادیبوں میں شمار نہیں ہوتا اور میں نے اس کی کتاب کسی خاص اشتیاق سے نہیں پڑھی، مگر کمبل نے مجھے چھوڑا نہیں۔ اس میں کوئی عظیم پیغام نہیں ہے۔ کوئی ڈرامہ بازی یا تکلف نظر نہیں آیا۔ یہ ایک صاحب احساس آدمی کا اعتراف ہے، جو کچھ اس نے زندگی میں دیکھا اور بھگتا، اس کی واردات اس نے اسی سادگی سے بیان کر دی جس سادگی سے اس نے زندگی کی۔ عقلی آدمی کے لیے اسی میں کوئی مواد نہیں۔ یہ دل کا قصہ ہے۔ اور اہلِ دل کے لیے ہے۔ آپ اسے پڑھ کر خوش ہوں گے، کیونکہ سچ اگر سچائی کے ساتھ بولا جائے تو خوشبودار ہو جاتا ہے۔

مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ مظہر سعید کو لکھنے کی مشق نہیں، مگر اس کے اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک کاریگر آدمی ہے۔ تحریر کی روانی بات کو دل میں اتار دیتی ہے۔ اس نے ایک چھوٹی سی پیاری کتاب لکھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑا ادیب ہے۔ افسوس! اس نے

زندگی پڑھنے اور برج کھیلنے میں ضائع کر دی۔ اگر وہ کچھ لکھتا تو کمال کرتا۔ بہر حال اب بھی وقت ہے۔ اگر وہ سنجیدگی سے لکھنا شروع کر دے تو اس کے لیے اور ہمارے لیے اچھا ہوگا۔" انو کھے سچ" آپ بھی ایک ہی نشست میں ختم کر دیں گے۔

——— احمد بشیر

RekhtaDownload.com

میں نے یہ کتاب کیوں لکھی

بچپن میں جنوں اور پریوں کی کہانیاں اتنی اچھی لگتی ہیں کہ روتے ہوئے بچوں کو سنائیں تو وہ چپ ہو جاتے ہیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہر انسان کا ہم زاد ہوتا ہے۔ ایک سائنس دان نے حال ہی میں کتاب لکھی ہے: God and New Physics۔ اس میں خدا کی ذات کو Scientific طریقے سے ثابت کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے ایک Chapter میں ایک یہ تھیوری بھی بتائی ہے کہ انسان کے کئی duplicates ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔

آپ اس پر سوچیں تو کچھ کچھ یقین آنے لگے گا کہ ہر انسان کے اندر ایک دوسری شخصیت بھی ہوتی ہے۔

جنوں اور پریوں کی کہانیاں بچپن میں اس لیے اچھی لگتی ہیں کہ ذہن fantasy میں کھو جاتا ہے۔ تکالیف بھول جاتی ہے۔ یہ اس دوسری شخصیت کا کمال ہے۔ جب انسان عمر میں بڑھتا ہے تو پریکٹیکل زندگی شروع ہوتی ہے۔ پہلے پڑھائی، پھر معاش کی تلاش، پھر شادی، پھر بچے، پھر چل سو چل۔ اس دوران میں وہ عجیب وغریب واقعات اور تجربات سے گزرتا ہے۔ خوشیاں ہوتی ہیں۔ غم ملتے ہیں۔ شدید محبت اور شدید نفرت کے جذبات سے گزرتا ہے۔

کچھ لوگ عقل سے کام لے کر ہر چیز کا جواز ڈھونڈ کر چپ ہو جاتے ہیں۔ کچھ ٹوٹ کر

RekhtaDownload.com

رہ جاتے ہیں۔ زیادہ لوگ قسمت کا حال جاننے والے نجومیوں کا رخ کرتے ہیں۔ اکثر پیروں فقیروں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ کچھ مذہبی ہو جاتے ہیں۔

میں کمزور آدمی ہوں۔ عقل بھی کافی نہیں۔ ان تمام جذبات اور تجربات سے گزر کر ایک fantasy کی دنیا میں پناہ کی تلاش کرتا رہا۔ پامسٹری، آسٹرالوجی کی تمام کتابیں پڑھ ڈالیں۔ پیروں، فقیروں کے چکروں میں پڑا رہا۔ مذہب میں دلچسپی بڑھ گئی۔ سائنس کو چھوڑ کر شخصی کرامات کو کمال سمجھنے لگا۔

اسی دوران میں قدرت اللہ شہاب کی کتاب شہاب نامہ پڑھنے کے بعد ان کے بیان کردہ super natural دنیا کی جستجو مجھے ممتاز مفتی تک لے گئی۔

اس fantasy میں مفتی صاحب مجھ سے بہت آگے تھے۔ لیکن مجھے ان کے ساتھ common ground مل گئی۔ ہم نے محبتوں کے جذبات ڈھونڈے۔ مرشد اور پیروں فقیروں سے ناتوں کا سوچا۔ تقریباً ہر موضوع پر بات کی۔ اس کا بیشتر حصہ ان سے خط کتابت میں موجود ہے۔

ساری عمر اس fantasy کی دنیا میں گزار دی ہے۔ انوکھے واقعات سنے اور پڑھے۔ جوتش اور علمِ نجوم کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ practical لوگوں کی بڑ سے کہ یہ سب کچھ کیا فضول باتیں ہیں، میں ڈرا رہا۔

اب سوچا کہ بہت سے لوگ ہوں گے جو میری طرح سوچتے ہوں۔ کیوں نہ ان تک اپنے یہ تجربات پہنچا دوں۔

—— مظہر سعید قریشی

نومبر ۲۰۰۱

یہ "میں" ہوں

اگرچہ سیانے کہتے آئے ہیں کہ شرم بہت اعلیٰ کوالٹی ہے، اس کے گن کہتے کہتے نہیں تھکتے۔ مگر مجھے تو زندگی میں جتنی مایوسیاں شرم کی وجہ سے ہوئی ہیں، وہ میں ہی جانتا ہوں۔

میں فیملی میں سب سے چھوٹا تھا۔ کچھ تو بڑے بھائی سے مار پڑتی تھی اور اس کی شرارتوں سے تنگ ہو کر والدین اکثر نصیحتوں کا سارا بوجھ "موئی گائے" سمجھتے ہوئے مجھ پر ڈال دیتے۔ اس ماحول میں دبا ہوا بچہ complex کا مارا ہوا، بڑا ہو کر شرم کی انگلی پکڑ کر زندگی گزارتا رہا۔

شرم نے کیا کیا اذیتیں دی ہیں: بیوی ناراض کہ دل و جان سے چاہنے کے باوجود تعریف کرنے سے قاصر رہا۔ کبھی کبھار کوئی گرل فرینڈ بنتی تو شرم پھر ساتھ نہ چھوڑتی اور وہ مجھے مردم بیزار سمجھ کر بھاگ جاتی۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کے امتحان میں پنجاب میں ٹاپ کیا۔ دوسرے نمبر پر۔ ایک کلاس فیلو یوسف صاحب ہوا کرتے تھے، وہ نمبر ون رہے۔ سنا ہے result آنے سے پہلے ہی وہ عشق کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے اور آج تک ان کا اتا پتا نہیں۔

ان دنوں یونیورسٹی میں فرسٹ وغیرہ آنے کی کوئی publicity نہیں ہوتی

RekhtaDownload.com

تھی۔ بھولے بھٹکے دو نیوز رپورٹر میرے گھر آئے کہ آپ کا فوٹو لے کر خبر چھاپنی ہے۔ یقین کریں میں گھر میں چھپ گیا۔ بہر حال خبر چھپی۔ ہمارے گھر میں ان دنوں کا مشہور اخبار'' civil & military gazette '' آیا کرتا تھا۔ اس میں اسی چھوٹی سی خبر کا تراشہ آج بھی نہ جانے کیسے بچا رہا:

Top in B.A & B. Sc

Mohd. Yosuf and Mazhar saeed Qureshi, of government college, lahore. secured the 1st and the 2nd positions in the punjab university B.A & B.sc examination held last May. They obtained 375and 363 marksrespectively.

میرے ماں باپ کو نہروں کے ہیڈ ورکس اور نہروں کی دنیا بہت خوب صورت لگتی تھی۔ انگریز ''S.D.O.'' جب نیکر پہن کر نکلتے تو دیسی لوگ ان کی دہشت سے چھپ جاتے۔ میرے ماں باپ نے میرے سامنے میری لائف کا روڈ میپ رکھ دیا: ''بیٹا نہروں کا 'S.D.O.' بننا ہے۔'' انجینئرنگ سے مجھے نفرت تھی۔ میں literature کی طرف رجحان رکھتا تھا۔ ہسٹری سے لگاؤ تھا۔

لیکن شرم آڑے آئی اور ماں باپ کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے اس profession میں کود پڑا۔

انہی دنوں chartered accountancy کا ایک اسکالرشپ نکلا۔ میری acedamic position دیکھتے ہوئے مجھے select کرلیا گیا۔

میرے ماں باپ کے چہروں پر افسردگی چھا گئی۔ ایک تو U.K جا کر ان سے دور ہونے کا غم اور دوسرے ان کی دیرینہ خواہش کہ ہائے ہمارا بیٹا accountant بن جائے گا۔ S.D.O. انہار کے سامنے ایک accountant کی کیا حیثیت ہے۔ profession کی

RekhtaDownload.com

selection کے لیے شرم کا یہ آخری وار تھا۔

اللہ کا کرم ہوا کہ ڈے ون ہی سے public service commision سے میری کلاس ون میں سلیکشن ہوگئی۔ پاکستان کے پہلے دور میں جب میرٹ تھا تو promotions اور postings اچھی رہیں۔ جب ''رنجیت سنگھی راج'' آیا تو میری شرم نے مجھے باز رکھا کہ سفارش کرواؤں یا خود جا کر اپنی تعریف کروں۔ چنانچہ بعض اوقات suffer کرنا پڑا۔ خدا کو رحم آیا تو میری گریڈ 21 میں ترقی ہوگئی۔ ورنہ شرم نے مجھے ہر جگہ بار بار مروایا۔

شرم کے لحاظ سے سیانوں کی بات پرانی ہو چکی ہے۔ اس سے پرہیز ہی بہتر ہے۔

THE CIVIL & MILITARY

GAZETTE SATURDAY AUGUST 20 1949

Top in B.A. & B.Sc.

Mohd. Yosuf and Mazhar Saeed Qureshi, of Government College, Lahore, secured the 1st and the 2nd positions in the Punjab University B.A. and B.Sc. examination held last May. They obtained 375 and 363 marks respectively.

RekhtaDownload.com

RekhtaDownload.com

ممتاز مفتی

ممتاز مفتی کی یاد

ممتاز مفتی سے ملنے کا شوق مجھے ان کے افسانوں یا تحریریں پڑھنے کے بعد نہیں ہوا بلکہ میں نے ان کا کوئی بھی افسانہ پڑھا ہی نہیں تھا۔ ''شہاب نامہ'' میں super natural چیزیں پڑھنے کے بعد مجھے قدرت اللہ شہاب سے متعلق تجسس ہوا کہ وہ کون تھے؟ کیا وہ پہنچے ہوئے اللہ والے تھے؟

کیا 90 سالہ فقیر نے ان کی مدد کی تھی؟ شہاب صاحب سے دو ایک مرتبہ میں احمد بشیر کے گھر ملا تھا لیکن اس وقت ان کی شخصیت کے اس پہلو کا علم نہ ہو سکا۔ ان کی وفات کے بعد میں احمد بشیر کے پاس گیا اور پوچھا: مجھے بتائیں کہ جو ''شہاب نامے'' میں لکھا ہے کیا وہ سچ ہے؟ احمد بشیر کہنے لگے کہ شہاب میرے دوست ضرور تھے لیکن ان کا اصل راز دان ممتاز مفتی ہے۔ تم اس کے پاس فلاں ایڈریس پر جا کر مل لو لیکن خبردار سرکاری گاڑی میں نہ جانا اور نہ ہی یہ بتانا کہ تم گورنمنٹ میں کوئی افسر ہو۔ مفتی کو افسروں سے چڑ ہے اور وہ ان کو نہیں ملتے۔ سردیوں کی ایک صبح میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کے اسلام آباد والے گھر جا پہنچا۔ ایک سادا سا کلین شیو جاذب نظر بڈھا لان میں دھوپ سینک رہا تھا۔ میں نے کہا: میں لاہور سے آیا ہوں۔ شہاب صاحب کا admirer ہوں اور آپ سے باتیں کرنی ہیں۔ کہنے لگے: بیٹھ جاؤ۔

یہ میری ممتاز مفتی سے دوستی کا آغاز تھا۔

ان کے خیال میں ہمارے حکومتی نظام کے ساتھ ساتھ اللہ کے دوست ولیوں کا parallel نظام بھی چل رہا ہے اور شہاب صاحب اس نظام میں شاید عہدے دار تھے۔

مفتی صاحب اپنی ذات میں خود چھوٹی سی کائنات تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ان کی کون سی بات لکھوں اور کیسے لکھوں، physical world کے احساسات کے تو وہ ماسٹر تھے ہی لیکن ان کا ذہن اور نگاہیں ہمیشہ invisible world کی طرف لگی رہتیں۔ درویشوں کی دنیا۔ اللہ کی وہ خوب صورت دنیا جو physical world والوں نے ابھی دیکھی نہیں۔

قسم قسم کے بابے ان کے دوست تھے کوئی بھائی جان محمد ہے تو کوئی سوٹڈ بوٹڈ executive۔ ان سے ملنے کے چاؤ میں مفتی صاحب سینکڑوں میل سفر خوشی سے کر لیتے۔

ان کا ایک واقعہ ''چھوٹا منہ بڑی بات'' ملاحظہ ہو۔ سکوٹر پر جا رہے ہیں۔ راستہ بھول جاتے ہیں اور پہیئے سے ہوا نکل جاتی ہے۔ شہر کے قریب جنگل میں ایک کٹیا ہے اور کٹیا میں ایک بابا ان کو ڈانٹتا ہے اور وظیفے کے لیے پرچی پر کچھ لکھ دیتا ہے۔ وہ پرچی جیب میں رکھ کر باہر آتے ہیں۔ سکوٹر کو کک مارتے ہیں وہ سٹارٹ ہو جاتا ہے۔ اس وقت ان کو یاد ہی نہ رہا تھا کہ پہیئے سے ہوا نکلی ہوئی ہے تھوڑی دور جا کر خیال آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہوا پوری ہی ہے۔ گھر پہنچ کر حیران ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ شاید پاگل پن کا دورہ پڑا تھا، ایسے ہی خواب تھا۔ چند دنوں بعد اس دن والی واسکٹ پہنتے ہیں تو وہی پرچی نکل آتی ہے۔ سکوٹر پکڑ کر پھر اسی جگہ پہنچتے ہیں تو وہاں نہ جنگل نہ کٹیا۔ ساتھ والا کنواں موجود ہے۔ سامنے والی دکانیں بھی موجود ہیں۔ جگہ بالکل وہی ہے لیکن کٹیا نہیں، بابا نہیں۔ وہاں کے لوکل چرواہے سے پوچھتے ہیں یہاں ایک کٹیا تھی وہ کہنے لگا: کیسی کٹیا؟ میں نے مفتی جی سے پوچھا کیا واقعی یہ واقعہ ان پر بیتا تھا؟ کہنے لگے: بالکل سچ بات ہے۔ تو پھر وہ کٹیا کہاں گئی؟ بابا کون تھا؟ جواب دیا۔ پتہ نہیں۔ تو یہ تھی مفتی صاحب کی invisible World کی ایک چھوٹی سی جھلک۔ مفتی جی super natural باتوں میں بہت

چسکا لیتے۔ مشہور لوک گائک طفیل نیازی سے ایک دفعہ پوچھتے ہیں۔ بھئی تم نے سنگیت کی بہت سی محفلوں میں شرکت کی ہے کیا کوئی ایسی محفل بھی تھی جسے تم ناقابلِ فراموش سمجھتے ہو؟ اس سوال پر طفیل مسکرایا۔ بولا: ہاں ایک محفل ایسی تھی جسے بھول نہیں پایا۔ ایک روز شام کے وقت ایک صاحب آئے کہنے لگے کہ پرسوں ہمارے ہاں ایک تقریب ہے آپ اپنی پارٹی لے آئیں۔ اس نے پیشگی کے بجائے ساری رقم مع آمدورفت کرایہ ادا کر دی اور ہمیں جگہ کا اتا پتا سمجھا دیا۔ یہ جگہ شہر سے پچیس تیس میل دور تھی۔ مقررہ روز ہم شام کے وقت وہاں پہنچ کر بہت حیران ہوئے کیونکہ ویرانے میں ایک بڑے بڑ کے درخت کے قریب ایک بڑا خیمہ لگا ہوا تھا اور خیمے کے باہر دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہم پہنچے ہی تھے کہ وہ صاحب آگئے اور محفل شروع ہوگئی۔ آدھی رات تک ہم گاتے رہے پھر انھوں نے ہم سے کہا کہ کسی وجہ سے برات نہیں آئی۔ اب آپ یہیں آرام کریں۔ صبح دیکھا جائے گا۔ اس پر ہم نے محفل ختم کر دی اور وہیں دریوں پر سو گئے۔ گرمیوں کے دن تھے، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی خوب نیند آئی۔ صبح جب ہم جاگے تو نہ وہ شامیانہ تھا نہ دریاں تھیں۔ ہم سب زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ سامنے بڑ کا درخت تھا جس کے قریب ہی ایک کھنڈر تھا۔ یہ دیکھ کر ہم پر خوف طاری ہو گیا اور اپنے ساز اٹھا کر وہاں سے بھاگے۔ اس واقعہ کو مفتی صاحب ریکارڈ کر کے لکھتے ہیں کہ طفیل کی مقبولیت اس مخلوق تک بھی جا پہنچی تھی جو کھنڈر، بڑ اور ویرانوں میں رہتی ہے۔ انھوں نے اسے سچ مان لیا اور سادگی سے کہہ دیا کیونکہ وہ اس کو سچ مانتے تھے۔

جنہوں نے ''شہاب نامہ'' پڑھا ہے وہ شہاب صاحب کے طالب علمی کے زمانے کی محبوبہ چندراوتی کو بھی جانتے ہوں گے۔ چندراوتی ایک ہندو لڑکی تھی۔ ایمن آباد کی رہنے والی تھی۔ لاہور میں تعلیم کے دوران میں شہاب سے ملاقات ہوئی اور شہاب صاحب بری طرح پھس گئے۔ پھر بے چاری کو ''ٹی بی'' ہوگئی اور شہاب سائیکل پر ایمن آباد جا کر اس کے کپڑے دھوتے۔ جب وہ مرگئی تو انھوں نے اپنی سائیکل بیچ کر اس کی بیوہ ماں کو ہردوار بھیجا تاکہ اس کی راکھ گنگا میں بہا سکیں۔ اب اس واقعہ سے متعلق سن لیں جو شہاب صاحب نے بتایا لیکن لکھا

نہیں۔

شہاب صاحب یو۔ کے میں ہیں۔ ان کی بیگم عفت صاحبہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ ٹانگ خراب ہے۔ چلا جاتا نہیں اور پیسے ہیں نہیں۔ ٹرین پر بیوی کی قبر پر جا رہے ہیں۔ قبرستان دو اسٹیشنوں کے درمیان ہے۔ جب ریل گاڑی قبرستان کے قریب پہنچتی ہے تو شہاب صاحب سوچتے ہیں کہ کیا ہی اچھا ہوتا ٹرین یہاں رک جاتی اور مجھے زخمی ٹانگ سے چلنا بچ جاتا۔

فوراً بعد ٹرین وہیں رک جاتی ہے۔ چندراوتی کا ہیولہ ظاہر ہوتا ہے۔ دروازہ کھل جاتا ہے اور چندراوتی جیسے کہہ رہی ہے۔ اترو۔ جلدی سے اتر جاؤ۔ شہاب صاحب کا سفر بچ جاتا ہے۔ یو۔ کے میں کبھی ایسا ہوا نہیں لیکن یہ ہوا۔

صاحبو، مفتی صاحب سچ کہتے تھے یا داستان گو تھے یہ آپ جانیں لیکن اس materialistic دنیا میں یہ ان دیکھی حقیقتوں کا رخ اب کون بتائے گا اور کون لکھے گا؟ اس پر مفتی جی کی بے شمار یادوں میں ایک رخ یہ بھی ہے:

نہ اٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگ گل تک بھی
یہ رفعت کی تمنا ہے جو لے اڑتی ہے شبنم کو

RekhtaDownload.com

ممتاز مفتی سے دوستی

ممتاز مفتی کی شخصیت بڑی دل کش تھی۔ آدمی خود بخود ان کی طرف کھنچا جاتا۔ میں کیسے کہوں کہ وہ میرے دوست تھے۔ میرے قریب تھے۔ وہ ایک عظیم ادیب تھے اور میں ان کے بہت سے چاہنے والوں میں سے ایک۔ البتہ دو چیزیں ہم میں کامن تھیں۔ ایک تو یہ کہ ہم ہمیشہ کرامات اور کرشموں کی دنیا میں Peep کے لیے کوشاں رہتے۔ نئے پرانے بابوں کی تلاش رہتی۔ درویشوں سے ملنے کے لیے مفتی صاحب کے ساتھ دور دور کے سفر کیے۔ پہلی ہی ملاقات میں مفتی صاحب کسی بابے سے ایسے بات کرتے جیسے کوئی Ph.D کا سٹوڈنٹ دوسرے ہم جماعت سے بات کر رہا ہو۔

یہ میری سمجھ میں بہت بعد میں آیا کہ بابے spiritual guidance کے لیے ٹھیک ہیں۔ دینوی خواہشات لے کر جانا نہ صرف گناہ ہے بلکہ ان کے بس کی بات بھی نہیں۔ میں تو بابوں کے چنگل سے بھاگ نکلا۔ اللہ کا شکر ہے۔ اب توبہ کرتا ہوں۔ لیکن مفتی صاحب کی سمت درست لگتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے ان کے مرشد قدرت اللہ شہاب ان کو راز آشنا کر چکے تھے۔

دوسری بات جو ہم میں کامن تھی وہ یہ تھی کہ ہم دونوں جماندرو romantic طبیعت رکھتے تھے۔ پریکٹیکل رومانس میں میرے خیال میں ہم دونوں اناڑی تھے۔ صرف منہ زبانی رومانس ہی ہماری حد تھی۔

ایک دفعہ مفتی صاحب فرمانے لگے: ''یار میں تمھارا ذکر اپنی تحریر میں کرنے لگا ہوں۔'' تو میں نے منتیں کرنا شروع کر دیں۔ ''ناں سائیں ناں، آپ تو ہمیشہ سچ بولتے ہیں میرا بھانڈا نہ پھوڑیں۔''

گوئٹے بہت بڑی شخصیت تھی۔ اسے کون نہیں جانتا۔ گوئٹے نے زندگی میں بہت عشق کیے۔ شہزادیاں duchesses اور اس قسم کی کون کون سی عورت نہ ہو گی جس سے گوئٹے کی دوستی نہ ہوئی ہو۔ اس کے باوجود اس نے ایک ٹھینوا ان پڑھ keep رکھی ہوئی تھی۔ جس سے ایک لڑکا بھی تھا۔ انیس برس بعد گوئٹے نے اس گنوار عورت سے شادی کر لی جس میں گواہ ان کا اپنا اٹھارہ سالہ لڑکا تھا۔

کسی نے گوئٹے سے پوچھا کہ صاحب آپ کی یہ intelectualism یہ ادبی محفلیں، یہ شہزادیوں سے دوستیاں اور شادی ان پڑھ سے؟ گوئٹے نے جواب دیا: ''دو intelectuals شروع میں بہت excite کرتے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جب اپنا سارا علم سنا سنا کر ختم کر لیتے ہیں تو وہ اتنے ہی زیادہ ایک دوسرے سے بور ہو جاتے ہیں۔ یہ ان پڑھ عورت مجھ سے ہمیشہ پوچھتی ہے اور ہماری دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اسی پوچھنے پوچھنے کی بات نے مجھے ممتاز مفتی کا قرب دیا۔ ان سے خط و کتاب ملاحظہ ہو:

ممتاز مفتی سے خط کتابت

(1)

Annex I

30 F.C.C

Gulberg, Lahore.

یکم دسمبر 1988

محترم مفتی جی

بڑی مشکل سے ایک مسیحا کی خبر ملی تھی۔ 84 سال کا پہنچا ہوا۔ قدرت اللہ شہاب کا جگری دوست ہی نہیں اس کے اندرونِ خانہ کا ساتھی بھی۔ ایک بار ملا، واہ واہ۔ دوسری بار ملا۔ کیا کہنا۔ تیسری بار ملا، بلے بلے۔ چوتھی بار ملنا چاہا تو فرمانے لگے: یار "دھوپ میں آنا" ہیٹ اور میرا سانس اکٹھے نہیں چل سکتے۔

دوسرے دن جیسے بچہ سکول سے بھاگتا ہے۔ شکر خدا کا۔ مفتی صاحب واقعی دھوپ میں بیٹھے تھے، بڑی محبت، بڑی شفقت، بڑی گرم جوشی سے باتیں سنیں اور کہیں، مجھے قدرت اللہ شہاب کا Ninety Years old young Faqir یاد آ گیا۔

تصوف کی بات کرو تو باریک تر نکتہ بتائیں گے۔ محبت کی بات کرو تو قوسِ قزح

RekhtaDownload.com

پرے اڑیں گے۔ عشق میں ناکامی کی بات کرو تو ہڈیاں تک ٹوٹ جانے کا حال بھی معلوم ہے۔

آنکھوں میں بلا کی تیزی، دل جوان، ہمت اور توانائی۔ 84 سالہ ایک کھلنڈرا بچہ۔ ادھر پھول دیکھا تو مسکرا دیا۔ انگارے کو ہاتھ لگایا، جلا تو چیخ لگا کر چھوڑ دیا۔ اسی وقت بندر کی طرف نظر پڑی تو اس کی حرکتوں میں کھو گئے۔

یا اللہ، یہ اتنا بڑا ادیب، زندگی کی کٹھن منزلوں سے گزرا ہے اور اتنا مطمئن! اتنا معصوم! آپ پر اللہ کا بڑا کرم ہے مفتی جی۔

جناب والا، ایک بات سچ سچ بتائیں، کیا واقعی آپ کا جگر کبھی خون ہوا ہے؟ کبھی دل میں چوب بھی لگی ہے کہ یونہی سمندر کے کنارے بیٹھ کر اس کی گہرائیوں کو ناپ لیا ہے؟ گستاخی معاف، اردو میں خط پہلی یا دوسری دفعہ لکھ رہا ہوں۔ غلطیاں معاف اور اگر material میں گستاخی ہو گئی ہو تو سزا دیں۔

آپ کا Admirer

مظہر

مکان 22 گلی 32

ایف 6-I اسلام آباد

مورخہ 22 دسمبر 88ء

پیارے مظہر، سیانے کہتے ہیں کسی کو رد کرنا ہو تو آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کے متعلق خوش فہمیاں پال لو، پھر ایک دن تمھاری آنکھ کھل جائے گی: ارے میں تو سمجھا تھا کہ یہ ایسا ہے لیکن یہ تو ویسا نکلا!

دیکھو بھائی، میرے متعلق خوش فہمیاں نہ پالو۔ میں ایک عام آدمی ہوں۔ مجھ میں اور تم میں صرف ایک فرق ہے۔ باقی باتوں میں ہم ایک جیسے ہیں۔ 1955ء میں مجھے ایک بابا ملا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا تھا۔ دیکھنے میں بزنس ایگزیکٹو لگتا تھا۔ خوش شکل تھا خوش پوش تھا۔ ٹھیکے دار تھا مکان تعمیر کرتا تھا۔ نام تھا خواجہ جان محمد۔

اس سے میں نے پوچھا: یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟ مجھے سمجھاؤ؟۔ اس نے کہا: دو راستے ہیں، جون سا چاہے اپنا لو۔ ایک راستہ سمجھنے کا دوسرا ہے مان لینے کا۔ جو سمجھنے کے شوقین ہیں وہ ساری عمر کھجل ہوتے ہیں، سمجھ سمجھ کر ہار جاتے ہیں، لیکن پلے کچھ نہیں پڑتا۔ جو مان لیتا ہے وہ سکھی ہو جاتا ہے۔

تم سمجھنے کے راستے پر چل نکلے ہو، اس لیے کھجل ہو رہے ہو۔ بے چین ہو، دکھی ہو، سوچوں کے بھنور میں ڈب جھلکیاں کھا رہے ہو۔

میں نے مان لینے کا راستہ اپنالیا، میں سکھی ہوں۔ سکھ ہی سکھ ہے۔

تم سمجھتے ہو میں سمجھتا ہوں اور سمجھا سکتا ہوں، یہ تمھاری بھول ہے۔

تم مجھ سے بہتر ہو۔ عہدے میں بہتر ہو، دینوی عزت میں بہتر ہو۔ انسانیت میں بہتر ہو۔ تم اللہ کے نزدیک تر ہو۔ ذہانت میں بہتر ہو۔ احساس میں بہتر ہو۔ حق میں گہرائی ہے۔ تم کسی بات میں کم تر نہیں ہو، صرف ایک فرق ہے۔ تمھیں سمجھ کی دیمک لگی ہوئی ہے۔

عقل عیار ہے سو بھیس بنالیتی ہے۔

ممتاز مفتی

RekhtaDownload.com

(2)

Annex I

30 F.C.C

Gulberg, Lahore.

9 جنوری 1989ء

مفتی جی،

آپ کے خط میں بہت چسکا تھا۔ دکھ ہے آپ سے پہلے ملاقات کیوں نہ ہوئی۔

میں کتے کرتارے.........کی طرح ان پڑھ ایک واہیات سا انسان آپ کے پلے پڑ گیا ہوں۔ بھیڑا شاگرد، عقل سے کھوٹا، ادھر آپ کی عظمت کا اندازہ اس چیز سے ہوتا ہے کہ نا سمجھوں کے لیے بھی آپ کے دل کے کسی گوشے میں دکھ ہے، درد ہے، بلکہ محبت ہے۔ اس چیز سے جسارت ہوئی ہے کہ کھری سناؤں اور کھری سنوں۔

آپ سیانوں کے حوالے سے کہتے ہیں کسی کو رد کرنا ہو تو آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کے متعلق خوش فہمیاں پال لو، پھر ایک دن تمھاری آنکھ کھل جائے گی: ارے میں تو سمجھا تھا کہ یہ ایسا ہے لیکن یہ تو ویسا نکلا۔ مفتی جی، سیانے بڑے بھولے اور آسان لوگ تھے۔ موٹی موٹی بات کرتے تھے۔ generalities میں بات کرتے تھے، لو جی۔ خوش فہمیاں پال لو اور غلط ثابت ہو

جائیں تو رد کر دو...... واہ بھئی واہ۔ کبھی سیانوں میں آپ اور مرزا غالب کے علاوہ کوئی عشق میں بھی مبتلا ہوا تھا؟

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

اس چکر میں انسان پھنس کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو مسلسل دھوکہ کیوں دیتا ہے؟ ہو گئے نا سیانے جھوٹے؟

آپ نے خواجہ جان محمد کا ذکر کیا ہے۔ اتنے بڑے گنجھل کا اتنا آسان علاج؟ گویا 1955ء میں حکیم خواجہ جان محمد نے ایک گولی دی جو آپ نے کھالی اور آپ کے سارے دلدّر صاف ہو گئے۔ ایسی گولی کوئی مجھے بھی دے دیں لیکن آپ تو پلہ ہی نہیں پکڑا رہے۔

مفتی جی! بہت عرصہ پہلے میں گاؤں میں عید کی نماز پڑھنے جایا کرتا تھا، وہاں کھلی جگہ تھی، گھنی چھاؤں، ساتھ ایک خانقاہ تھی، کونے میں ایک کمرہ ہوتا تھا۔ وہاں چند ملنگ رہا کرتے تھے۔ ہم عید میں مصروف ہوتے لیکن وہ اپنے آپ میں مگن ہوتے جیسے کسی سے کوئی سروکار نہیں۔ ان میں ایک بھنگ کو اس طرح صاف کیا کرتا جیسے کوئی سگھڑ عورت داماد کے لیے پلاؤ کے چاول صاف کرتی ہے۔ دوسرا باداموں کے چھلکے اتار کر ہیرے اور جواہرات کی طرح پکڑے پیار سے ایک ایک چنتا۔ تیسرا کونڈی ڈنڈا صاف کرنے میں ایسا مصروف ہوتا جیسے اس میں چاند آ کر گرنے والا ہو۔ ہم وعظ سنتے، خطبہ سنتے، نماز پڑھتے لیکن وہ وہاں اس احاطے میں ہوتے ہوئے بھی الگ تھلگ، بے نیاز، اپنے کام میں مگن رہتے۔ عید کی نماز سے فارغ ہو کر جاتے ہوئے ان کو دیکھا کرتا تو کونڈی ڈنڈا چل رہا ہوتا۔ سب کی آنکھ میں چمک۔ ان کو نہیں پتہ کون آ رہا ہے، کون جا رہا ہے۔ مگن ہیں، مست ہیں، بے نیاز ہیں۔ ان دنوں مجھے ان پر غصہ آتا اور کبھی حیرت ہوتی۔

مفتی جی، آج کل میرا جی کرتا ہے ایسا تکیہ ملے، ایسی ہی بے نیازی ہو اور وہ نشہ

یا اس نشے کی تمنا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ''چھڈ یار''!

کسی نے ایک شعر کہا ہے جو مجھے یاد نہیں لیکن اس کا مطلب کچھ اس طرح ہے کہ انسان اتنی خوب صورت زندگی گزارے، اتنی خوب صورت اتنی خوب صورت کہ موت اگر دائمی بھی ہو تو خدا پاک کو خیال آجائے کہ ایسی خوب صورت زندگی ختم کیوں کروں۔ آپ نے اپنی زندگی خوب صورت کرلی ہے۔ لیکن آپ کے اس فدوی نکمے شاگرد کا حال یہ ہے کہ

مے خانے میں عاجز ہوئے افسردہ دلی سے
مسجد کا نہ رکھا ہمیں آشفتہ سری نے
یہ جامۂ صد چاک بدل لینے میں کیا تھا
مہلت ہی نہ دی فیض کبھی بخیہ گری نے

پلیز مفتی جی، مجھے سوچ کی دیمک کھا جائے گی۔ مجھے اس کا شدت سے احساس ہے، اس سے کب اور کیسے چھٹکارا ملے گا؟

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی

آپ کا
مظہر

RekhtaDownload.com

مکان 22 گلی 32

ایف 6-1

اسلام آباد

مورخہ 18 جنوری 1989ء

مظہر، بڑا خوب صورت خط لکھا ہے تم نے!

پھر تم یہ کہتے ہو کہ اردو لکھنی نہیں آتی!

اب بولو، میں کس بات کو مانوں؟ کسے نہ مانوں؟

کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم میں ایک عورت چھپی بیٹھی ہے، اندر کھچڑی پکی ہوئی ہے، غور و فکر میں بھی شدت جذبات میں بھی شدت۔ ایک جانب محبوب جلوہ دکھا رہا ہے دوسری جانب عاشق مونچھ مروڑ رہا ہے۔ شرماؤ نہیں، مجھ میں بھی 30 فی صد عورت ہے۔ جب تک عورت کا پیوند نہ لگا ہو، فن کار نہیں بنتا۔ خالص مرد تو کاٹھ ہوتا ہے۔ تم بڑے ناشکرے ہو مظہر۔ اللہ نے تمھیں اتنا کچھ دیا ہے، قصور اللہ کا نہیں تمھاری سمجھ کا ہے۔

یہ بابے جو ہیں یہ کوئی گولی نہیں دیتے۔ منتر نہیں پھونکتے۔ گردن موڑ کر تمھارا رخ بدل دیتے ہیں۔ پہلے تم مغرب کی طرف دیکھ رہے ہوتے ہو پھر مشرق کی طرف دیکھنے لگتے ہو۔ صرف زاویۂ نگاہ بدلتا ہے۔

دیکھو تمھارا زاویۂ نگاہ بدل رہا ہے۔ آج تم کانٹوں سے گھرے کھڑے ہو۔

ایک دن تم دیکھو گے کہ پھولوں سے گھرے کھڑے ہو۔ چمن میں تم چاہو تو کانٹے دیکھو چاہو تو پھول دیکھو۔

ممتاز مفتی

RekhtaDownload.com

(3)

Annex I

30 F.C.C

Gulberg, Lahore.

29 جنوری 1989ء

مفتی جی!

آپ کا خط ملا۔ بیوی کہنے لگی تم تو اسے اتنی بار اور یوں پڑھ رہے ہو جیسے بیس سال کی روٹھی ہوئی لڑکی کا محبت نامہ مل گیا ہو۔ جی ہاں، جنابِ والا، چاہے چوں کریں چاہے چاں کریں۔ اب آپ پھنس گئے ہیں۔ میں نے نہیں چھوڑنا۔

اپنے زمانے میں فرانس کی نہایت خوب صورت اداکارہ برجت باردت سے متعلق آپ جانتے ہوں گے کہ اس نے بہت سے کتے پال رکھے ہیں۔ انسانوں کو کم ملتی ہے۔ وجہ یہ بتاتی ہے کہ انسان تو وفادار نہیں ہوتے۔ کتوں میں وفا بہت ہے۔

کتوں کے متعلق پطرس بخاری نے بہت کچھ لکھا۔ بلکہ ان کی Categories بھی بتائیں۔ حلوائی کی دکان کا کتا، قصائی کی دکان کا کتا، سوچ میں گم ہونے والا فقیر کتا جو عین سڑک کے بیچ لیٹا رہتا ہے، میم صاحبہ کی گود سے کود کر ہلکی سی بخ لگانے والا کتا۔ مفتی جی نہ جانے آج میرے ذہن پر یہ کتے کیوں سوار ہیں۔ آیئے ذرا ان سے متعلق اکٹھے سوچیں۔ وہ باتیں بھی کریں

جو پطرس مرحوم بھول گئے تھے۔ ویسے ان کا کتوں کے بارے میں کوئی اچھا خیال بھی نہیں تھا۔

"گستاخی معاف، کتوں سے متعلق آپ سے مخاطب ہوں۔ لیکن مفتی جی، یہ اتنے برے بھی نہیں ہیں۔ اصحابِ کہف کے ساتھ غار کے باہر پڑے رہنے والے کتے کے متعلق اللہ نے قرآنِ پاک میں اس کا ذکر کر کے سوچیے اس کتے کو کتنا بڑا اعزاز دیا۔

کتوں کے بارے میں بابے بلھے شاہ کا توڑا تو آپ کو یاد ہوگا:

بھونکن توں بند مول نہ ہندے
جا روڑی تے سَتے، تیتھوں اتے
خصم اپنے دا در نہ چھڈدے
بھاویں وجن جتے، تیتھوں اتے

ایک بہت بڑے بزرگ کا واقعہ میں نے پڑھا تھا، وہ کچھ ایسے تھا کہ وہ پاک کپڑے پہنے سفر پر جا رہے تھے کہ ایک "کھرک کھادا" کتا پاس سے گزرا۔ ان بزرگ نے فوراً اپنا لباس سکیڑا کہ پلید نہ ہو جائے۔

کتا بولا: "اگر میں کیچڑ بھرا نہیں ہوں تو کوئی نقصان نہیں ہوا اور اگر میرا کیچڑ آپ کو لگ گیا ہے تو سات سمندروں کا پانی بھی آپ کے لباس کو پاک نہیں کر سکے گا۔"

بزرگ کرنی والے تھے۔ بولے: "یار تم باہر سے گندے ہو لیکن میں اندر سے گندا ہوں۔ چلو اکٹھی کوشش کرتے ہیں، اکٹھا سفر کرتے ہیں۔"

کتا بولا: "ہمارا ساتھ مشکل ہے۔ مجھے سب نے reject کر دیا ہے لیکن آپ کو سب جھک کر سلام کرتے ہیں۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں دردر کرتے ہیں، پتھر مار کر بھگا دیتے ہیں۔ میرے پاس آج کے لیے بھی ایک ہڈی نصیب نہیں۔ پر آپ کے پاس ہفتے بھر کا راشن موجود ہے۔ آپ میرے ساتھی نہیں بن سکتے اور نہ آپ میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔"

بزرگ سوچ میں پڑ گئے۔ "میں ایک کتے کے ساتھ چلنے کے قابل بھی نہیں؟

بتائیے، کیسا ہے؟

میں سوچتا ہوں کتے مجھ سے بہتر ہیں۔ مجھ میں حسد ہے، انا ہے، ان میں کوئی انا نہیں۔ وہ وفادار ہیں، مجھے تھوڑا سا دکھ پہنچے تو ٹال مٹال کرتا ہوں۔ البتہ ایک خصلت مجھ میں اور کتوں میں سانجھی ہے۔ آپ کار یا موٹر سائیکل پر جا رہے ہوں تو کتے بھاؤں بھاؤں کر کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ آپ اور تیز چلائیں گے وہ اتنا ہی تیز بھاگیں گے اور بھونکیں گے بھی۔ پھیپھڑوں کا پورا زور لگا دیں گے یعنی آپ جاتے کہاں ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر آپ کار کھڑی کر لیں تو وہ بھونکنا بھی بند کر دیتے ہیں اور بھاگنا بھی بلکہ دم ہلانا شروع کر دیتے ہیں۔ بالکل میری طرح!

مفتی جی، نہا دھو کر، صاف ستھرا ہو کر کتے کی کھال پہن کر برجت بارود کے پاس نہ چلا جاؤں؟ کیا پتہ وہ اپنا ہی لے۔

آپ کا

Admirer

مظہر

مکان 22 گلی 32

ایف I-6

اسلام آباد

مورخہ یکم فروری 1989ء

مظہر، خط ملا۔ شہاب کہا کرتا تھا کہ ماں کے قدموں میں جنت ہے اور بیوی کے قدموں میں ولایت ہے۔ یہ ولایت عام ولایت سے زیادہ پکی ہوتی ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے کشٹ اٹھانا نہیں پڑتا۔ بیوی صرف توجہ طلب ہوتی ہے، چاہے سچی ہو یا جھوٹی بس توجہ ہو۔ گھریلو خوشی حاصل کرنا کتنا آسان ہے اور گھریلو خوشی دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے۔

عورت کو وفا نہیں، صرف توجہ کی طلب ہوتی ہے چاہے وہ بارجت ہو یا بیوی ہو۔ عورت کو خوش رکھنا بہت آسان ہے۔ صرف ایک فقرہ۔ تم کتنی اچھی ہو۔ بار بار۔ اتنی بار جیسے ریکارڈ پر سوئی اٹک گئی ہو۔

تمھارا خط، خط تو نہیں رہا۔ یہ تو کتے پر ایک مضمون بن گیا ہے۔ اگر کتے جیسی طلب توجہ اور وفا شعاری پیدا کرلو تو پھر باردت کی طرف کیوں جاؤ۔ اللہ کی دہلیز پر کیوں نہ جا بیٹھو جہاں سے کسی کو دھتکارا نہیں جاتا۔ جہاں کسی پر دروازہ بند نہیں کیا جاتا۔ جہاں پاکیزگی اور پلیدگی کو خاطر میں نہیں لایا جاتا۔ صرف طلب، طلب، طلب۔

میں 8 فروری کو پی کے 381 میں لاہور پہنچوں گا جو یہاں سے 12 بجے روانہ

ہوگا۔ اگر آسانی سے ممکن ہوتو بانو اور پروین کوفون کر کے بتا دینا۔

دلی کو روانگی 9 فروری کو 2 بجے ہوگی۔ واپسی پر لاہور ٹھہرنا ممکن نہیں۔

اجمیر جا کر خواجہ کو سلام کرنے حاضری دوں گا۔ تمھاری بات بھی کروں گا کیا پتہ خواجہ ہی ترنگ میں آ کر میری بات سن لیں۔ سن لیں تو بہت اچھے، نہ سنیں تو اتنی تسلی کیا کم ہے کہ اتنے بڑے دربار میں حاضری دی۔

ممتاز مفتی

RekhtaDownload.com

(4)

لاہور

16 مارچ 1989ء

مفتی جی،

اللہ کرے آپ صرف صحت یاب ہی نہ ہوں بلکہ ہٹے کٹے ہو جائیں۔ زندگی میں عمر کچھ بھی ہو، موت پر Contemplation بہت صحیح سمت ہے۔ انسان کا ''رخ'' ہی تو سب کچھ ہے۔ اللہ آپ کو اتنی ہی عمر اور دے، پر ایک بات سن لیں۔ جتنی خوب صورت دنیا آگے ہے، یہ تو کچھ بھی نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ کے تعلقات ''اس ہستی'' کے ساتھ کیسے ہیں۔

اپنی writing سے متعلق اب کچھ چند الجھنیں ہیں۔ mind بھی کیا چیز ہے۔ ایک سیکنڈ میں کروڑوں ideas آ جاتے ہیں۔ صوفی لوگ تبھی تو اسے "Mini Cosmos" سے تعبیر کرتے ہیں۔ بات عنوان کے بارے میں ہے۔

بیڑا غرق ہو Somerset Maugham کا جس کو میں بہت پہلے بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ اس نے لکھا کہ Love فضول اور فوری ختم ہونے والی چیز ہے۔ اصل میں سب کچھ Loving Kindness ہے۔ میرا تجربہ اس سے بالکل opposite ہے۔ پچھلی دفعہ جب آپ لاہور آئے تھے تو بانو کے گھر جب میں نے explain کیا تو سائرہ ہاشمی نے کہا تھا کہ کہانی کا نام Loving Kindness رکھ دو۔ میں نے انٹ شنٹ تھوڑا بہت لکھ لیا ہے۔ لیکن

یہ عنوان مجھے بہت ستا رہا ہے۔

کئی دفعہ اچھے شعر نظر سے گزرتے ہیں تو وہ سارا مفہوم بیان کر جاتے ہیں

مثلاً:

تم ہی نہ سن سکے اگر قصہ غم سنے گا کون؟
کس کی زباں کھلے گی پھر ہم نہ اگر سنا سکے

یا

کتنی کٹھن گھڑی بھی ہو، تنہا گزار لو
ناواقفوں سے ٹھیک نہیں آشنائیاں

کیا کہانی کا عنوان شعر بن سکتے ہیں؟ کیا کبھی ایسا ہوا ہے؟ شاید نہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

آپ کی شاگردی میں نیا ہوں، آپ مجھے یہ بتائیں کہ لکھتے لکھتے یہ عنوان کا عنصر کیوں آجاتا ہے؟ کیا یہ Natural ہے؟ اور پھر عنوان کی Selection سے اسٹوری پر اثر تو نہیں پڑتا؟ میرا تو خیال ہے کہ ضرور پڑتا ہے۔ تبھی تو بیچ میں آپ کا مشورہ لے رہا ہوں۔ اگر عنوان ''حادثہ'' رکھوں تو کیسا ہے؟ مفتی جی، آپ مجھے بے وقوف خیال کرتے ہوں گے جو کہ میں ہوں، لیکن عنوان پر آکر میری سوئی اٹک گئی ہے۔

اب کچھ اپنے بارے میں۔ کسی سے محبت ہو تو جی کرتا ہے اپنے آپ کو فنا کرلوں لیکن اس کو بتانا نہیں۔ اگر مل جائے، سامنے بیٹھے، تب بھی آنکھ چرا جانی، دل مر رہا ہو، زبان پھر بھی سخت، آپ کہتے ہیں کہ کہتے جاؤ، تم کتنی اچھی لگتی ہو، کتنی اچھی، کتنی اچھی، بار بار، بار بار۔

آپ کہتے ہیں وفا کچھ بھی نہیں، توجہ، توجہ، توجہ۔ یعنی الفاظ بازی۔ یعنی بیچ بیچ۔ مفتی جی، مجھ سے نہ آج تک ایسا ہوا ہے اور نہ میں کر سکتا ہوں۔

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

مفتی جی میرا زاویۂ نگاہ واقعی بدل رہا ہے۔ وہی شعر یاد آرہے ہیں جو جج سے واپس آکر آپ کو fit ہوئے ہوں گے۔

وہ شیشہ ہائے مے کشی
کہ مصلحت اسی میں تھی
جنہیں وہیں پڑے پڑے
وہیں کی خاک کھا گئی
پھر ان کو ڈھو رہا ہوں میں
یہ کیا بنا رہا ہوں میں

معاف فرمائیں۔ آج کا خط سوال نامہ زیادہ خط کم ہے۔

ایک اور مسلسل خیال اور احساس!

میں جو ہوں، جو میں ہوں، اس سے تھک گیا ہوں۔ کیا کروں؟

آپ کا
مظہر

RekhtaDownload.com

اسلام آباد

مورخہ 17 مارچ 89ء

مظہر، واقعی میں عنوان بہت پریشان کرتا ہے۔

میرا طریق کار یہ ہے کہ پہلے کہانی لکھتا ہوں، پھر عنوان قائم کرتا ہوں۔ عام طور سے کہانی کا سنٹرل آئیڈیا، عنوان بن جاتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ مرکزی خیال کو ہی عنوان بنایا جائے۔ کئی بار سسپنس کے لیے عنوان رکھنا پڑتا ہے۔ عام طور سے عنوان کہانی سے ہی نکل آتا ہے۔ بہرحال یہ چیز اس قدر اہم نہیں۔

پچھلی کہانی جو میں نے لکھی تھی عنوان تھا، ''دیکھن دِکھن'' یہی مرکزی خیال تھا۔ اس سے پہلے ''پھیلاؤ کی زیربی'' مطلب تھا پھیلاؤ کا انسان کے کردار پر اثر۔ یہ کہانی صحرا کی تھی۔ دیکھن دِکھن گیت کا مکھڑا بھی ہو سکتا تھا۔ مکھڑا تھا۔ کا مکھ لے کر گھر جاؤں۔ یعنی کس منہ سے گھر جاؤں۔ گھر کا مطلب گھر بھی ہو سکتا ہے وطن بھی۔ دوسرا جہان بھی۔ بہرحال عنوان جو چاہے رکھو، بوجھل نہ ہو، لمبا نہ ہو، عام نہ ہو۔

سٹرسٹ ایک تو اپاہج تھا، دوسرا احساسِ کمتری کا مارا ہوا تھا۔ اس کے جذبات میں بڑی لے ہے۔ بڑا درد ہے، دکھ ہے۔ وہ بڑا آدمی تھا۔ بڑا اس لیے نہ تھا کہ اپاہج تھا بلکہ اس لیے کہ پیدائشی طور پر چھوٹا بندہ تھا، جب وہ کہتا ہے کہ Love فضول ہے، ختم ہو جانے والی چیز ہے۔ اس کا مطلب Passion سے ہے وہ تو محبت کا مارا ہوا تھا۔ ورد تو جان ہوا جاتا ہے کے

RekhtaDownload.com

مصداق۔

عنوان اس قدر اہم نہیں ہے کہ سوئی کو اٹکنے دیا جائے، اہم ہانڈی ہے ڈھکنا نہیں، کھیر ہے پلیٹ نہیں۔

دیکھ مظہر! اللہ نے ہر انسان کو ''واحدہ لاشریک بنایا ہے۔ ہر شخصیت کا رنگ اپنا ہے، ذائقہ اپنا ہے، خوشبو اپنی ہے اور یہی انفرادیت اس کی خصوصیت ہے۔ تمھاری عظمت اس میں ہے کہ تم مظہر ہو۔ Be Thyself والی بات ہے۔ دوسروں کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ تم وفا کو خوبی سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے۔ وفا کو خوبی سمجھنے والے اکثر مار کھاتے ہیں۔ اگر مار کھانے سے دلچسپی ہے تو بسم اللہ کھاؤ، چشمِ ما روشن دلِ ماشاد۔ میں نے بھی 16 سال مار کھائی تھی اب کھانے کی ہمت نہیں رہی۔

زندگی، زاویہ نظر کا دوسرا نام ہے۔ اللہ جب بھی کرم کرتا ہے بندے کا رخ بدل دیتا ہے، اگر زاویہ بدل رہا ہو تو خوشی کی بات ہے۔

ممتاز مفتی

(5)

لاہور

29 مارچ 89ء

مفتی جی!

شکر ہے عنوان سے میری جان چھڑائی۔ جناب یہ آپ Somerset Maugham کے دیر کیوں پڑ گئے ہیں کہ وہ احساس کمتری کا مارا ہوا تھا۔ میں تو اب تک اس کے انداز کا عاشق ہوں۔ ہمیشہ جیسے اس نے محسوس کیا سچ سچ لکھ دیا۔ کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی۔

آپ کی technique کہ ''کتنی اچھی لگتی ہو'' ''بار بار''، میں نے صرف ایک بار بیوی پر آزمائی تو حیران رہ گیا، آپ سچے تھے۔ دوسری دفعہ کہا تو وہ ہنس پڑی کہ وہ ''ممتاز مفتی صاحب والی بات'' (اس نے آپ کا خط پڑھ لیا ہوا تھا)۔ مفتی جی آپ نے یہ نسخہ بہت دیر سے سیکھا اور سکھایا۔ پھر یہ بات اتنی عام اور کھوتے چڑھی ہوگئی ہے کہ جب آپ ہندوستان جانے لگے تھے تو سائرہ ہاشمی نے آپ سے کہا تھا کہ اگر آپ کو سری دیوی مل گئی تو آپ نے فٹ کہنا ہے۔

''اوئے کڑیئے، توں ہن تک کتھے سیں۔''

بلے بلے۔ آپ نے وفا میں 16 سال مار کھائی۔ لیکن جناب والا میری ناچیز رائے میں یہ ''مار'' کی بھٹی ہی نے آپ کو وہ ممتاز مفتی بنایا ہے جو کہ آپ اس وقت ہیں۔

مفتی جی، یہ Briget Bardet اور کتوں نے ابھی میرا پیچھا نہ چھوڑا تھا کہ یہ

اخباروں میں آج کل ''پامیلا'' آن ٹیکی ہے۔ یہ ہندوستان کی Beauty Number One ہے اور اس کے بیسیوں عاشقوں کی داستانیں شائع ہو رہی ہیں۔ ابھی تک تو اسے casual reading ہی دی تھی لیکن آج کی ''جنگ'' نے تو چسکا پیدا کر دیا ہے۔ اخبار میں منشیات کے سمگلر ڈوگلس کی تصویر شائع ہوئی ہے اور کہا گیا ہے کہ پامیلا ڈوگلس کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے محبت کرتی تھی اور شہزادوں اور بڑی بڑی پارٹیوں میں اس کو ساتھ لے جانے پر اصرار کرتی تھی۔ پامیلا نے اپنی سہیلی کو بڑے پر اعتماد لہجے میں بتایا کہ وہ کسی وقت بھی ڈوگلس سے شادی کر لے گی۔ جب ڈوگلس کو پامیلا کے دوسرے کردار کا پتہ چلا تو اس نے اس کے دیئے ہوئے تحائف واپس کر دیئے اور علیحدہ ہو گیا۔ اس کے حسن اور grandeur کے باوجود!

مفتی جی! جان بخشی ہو تو آپ سے ایک سوال ہے۔ آنکھیں بند کر لیں۔ خیالات اور جذبات میں کھو جائیں۔ آپ ڈوگلس ہیں اور پامیلا وہ ہو جس کے لیے 16 سال مار کھائی۔ آپ کو وہی پتہ چلے گا جو ڈوگلس کو اس کے دوسرے کردار کا چلا تھا، تو آپ کیا کرتے؟ علیحدہ ہو جاتے؟

آپ کا

مظہر

RekhtaDownload.com

اسلام آباد

خبردار پامیلا کا نام مت لو۔

پہلے "وضو" کرو۔ پھر نام لو۔ پامیلا برجت بارود نہیں ہے۔ وہ تو خالی جسم تھی۔ خالی جسم تو صابون کا بلبلا ہوتا ہے۔ حسن بھی کوئی چیز نہیں، اصل چیز تو شخصیت ہے۔ حسن دیا ہے اگر پیچھے سے شخصیت کی سپورٹ نہ ہو، دیئے میں شخصیت کا تیل نہ ہو تو دو دن میں بتی جل کر راکھ ہو جائے گی۔ پامیلا میں بڑی زوردار شخصیت ہے۔ وہ تیکھی ہے، کسیلی ہے، تند ہے، ترش ہے۔

مرد میٹھی کو پسند نہیں کرتا، آ جا، کو پسند نہیں کرتا۔ ہٹ پرے کو پسند کرتا ہے۔ مان لیا کہ ڈوگلس نے تحائف واپس کر دیئے لیکن پامیلا کا نام دل سے نہیں مٹا سکے گا، وہ اور گہرا ہو گیا ہو گا۔

میرے پیارے ہم وفا کے طالب نہیں ہیں۔ ہم سیکورٹی کے خواہش مند نہیں ہیں، ایڈونچر کے ہیں۔ جب تک خاتون میں بے وفائی کی جھلک نہ ہو ہرجائی رنگ نہ ہو وہ محبوب نہیں بنتی۔

تم میرے متعلق پوچھ رہے ہو۔ بھائی میرے میں تو محبوبہ بناتا ہی اسے ہوں جس کی سرکشی سامنے دھری ہو، جو مجھے جوتی پر لکھے۔ پامیلا عام کردار نہیں وہ سو فیصد محبوب ہے۔ حسین کم ہے کراری ہے، کڑاکے والی ہے، گلاب دار بھی ہے۔ ایسی خواتین روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔

دیکھو مظہر، ایک بات جان لو۔ گھر کو جنت بنانا ضروری ہے۔ اگر جینا چاہتے ہو تو پہلے گھر کو جنت بناؤ۔ یہ کام مشکل نہیں، آسانی سے تکمیل ہو سکتی ہے۔ پامیلا کی سی ایک کھلاڑی تھی، کسی نے پوچھا بی بی اگر تیرے میاں کو زکام ہو جائے تو تجھے کوئی بتائے کہ اپنے favourite lover کی بھرجی بنا کر میاں کو کھلائے گی تو وہ صحت مند ہو جائے گا تو؟؟

بولی: اگر دس عاشقوں کی بھرجی کھلانی پڑے تو بھی کھلا دوں گی۔ میاں کی صحت ضروری ہے، گھر کا سکون ضروری ہے۔ نہ ہو، تو باہر کی زندگی بھی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایسے ہی بیوی دس محبوباؤں سے اہم تر ہے۔ میرے خط سنبھال کر رکھا کرو، اگر بی بی ناراض ہو گئی میں تو مارا جاؤں گا۔ نہ بھائی، وہ پہلے تم بعد میں۔

یار میں بیمار ہوں۔ لکھا نہیں جا رہا۔ کتاب رکی پڑی ہے۔ دراصل جب تک موسم پوری طرح نہیں بدلتا، ٹھیک ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ تم میرے لیے دعا کیا کرو۔

ممتاز مفتی

RekhtaDownload.com

30 ایف۔سی۔سی گلبرگ

لاہور

15 اپریل 89

مفتی جی،

مہاتما بدھ enlightenment کے بعد ایک شہر میں تھا تو وہیں ایک کنجری رہتی تھی۔ بہت خوب صورت، حسین، جیسے آپ نے لکھا کراری، کڑاکے والی، گلاب دار بھی، تیکھی، کیلی، تند اور ترش...... اس کنجری کے پاس سینکڑوں شہزادے، مہاراجے بچ بچ کر کے جان حاضر کرنے تیار رہتے۔ اس کی قربت کے لیے وہ کیا کچھ نہ کر گزرتے...... جب اس نے گوتم بدھ سے متعلق سنا تو حیران ہوئی کہ یہ کیا شے ہے جو میرے پاس نہیں آتا۔ سمجھتا کیا ہے اپنے کو۔ بڑا انتظار کیا، جلی، بھنی، آخر نوکرانی بھیجی۔ بدھ نے جواب دیا۔ ''بی بی تمھیں ملوں گا پر جب میں چاہوں گا۔''

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کنجری کی رقابت میں سارے راجے مہاراجے لڑ پڑے۔ جنگیں ہوئیں، سیکڑوں، ہزاروں آدمی مارے گئے۔ آخر سیانوں کو خیال آیا یہ کشت وخون بند ہونا چاہیے۔ بڑی سوچ بچار کے بعد انھوں نے کہا کہ ''فڈ'' کو ختم کرو۔ اس کنجری کو پکڑا۔ اس کے بال مونڈ دیئے۔ ناک کاٹ دی، کان کاٹ دیئے۔ منہ کالا کر کے چوراہے پر بٹھا دیا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

جب اس کا یہ حال ہوا تو اس وقت گوتم بدھ خود چل کر اس کے پاس گیا اور کہا۔

''جتنی چاہو مجھ سے محبت لے لو۔''

مفتی جی۔ اس پامیلا کے ساتھ وفا کس نے کی، بچ بچ کرنے والے عاشقوں نے یا گوتم بدھ نے۔ اس پامیلا کے لیے وفا اچھی کہ واہ وا۔ آپ کا دوسرا فلسفہ کہ خاوند کو زکام سے بچانے کے لیے پامیلا جیسی کھلاڑی اپنے favourite lover کی بھرجی بنا کر کھلا دے، غلط ہے، بالکل غلط (معافی چاہتا ہوں) کہیں کہیں یہ شاید ٹھیک ہو لیکن کم از کم Universal truth نہیں ہے۔ آپ کا مشاہدہ مجھ سے زیادہ ہے لیکن پامیلا جیسی اپنے خاوند کو قبر میں اتار کر ''گلیاں ہو جان سنجیاں تے وچ مرزا یار پھرے'' کی طرح ''بابر بعیش کوش'' ہو جاتی ہیں، آپ سے بڑھ کر اور کون زیادہ جانتا ہوگا کہ:

Truth is Stranger than Fiction

مفتی جی، آپ نے ''ایتھوں پٹنا، اوتھے لونا'' کے فلسفے پر اپنی تحریروں میں خاصی روشنی ڈالی ہے۔ بلکہ ایک بزرگ کی مثال بھی دی ہے جو کنجری کے پاس رات گزار کر بغیر گناہ کئے واپس آگئے تھے۔ سچ پوچھیں تو مجھے یہ مثال کچھ اچھی نہیں لگی تھی، بلکہ مجھے آپ کے فلسفے ہی پر شک ہونے لگا تھا۔ حال ہی میں میں نے حضرت خواجہ نظام الدین محبوبِ الٰہی کی کتاب میں ایک بزرگ کا واقعہ پڑھا۔

ان بزرگ نے شہر کے باہر ایک غار میں اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ ایک پاؤں غار کے اندر اور ایک غار کے باہر۔ عالم تحیر میں کھڑے رہتے۔ جب بابا فرید گنج شکرؒ ان سے ملنے گئے تو بزرگ نے فرمایا۔ ''کیسے آئے'' اس کے بعد...... تین دن تک خاموش رہے۔ تیسرے دن بولے۔ ''اے فرید، میرے قریب مت آئیو، ورنہ سوختہ ہو جاؤ گے اور میرا ماجرا سن لو۔ آج ستر سال ہو گئے ہیں اس غار میں رہتے ہوئے، ایک دن عورت یہاں سے گزری تھی تو میرا دل اس کی طرف مائل ہوا۔ چاہا کہ باہر نکلوں اتنے میں غائب سے آواز آئی۔

"ارے تو تو کہتا تھا کہ میں نے غیر اللہ کو چھوڑ دیا۔" بس اتنا تھا کہ میرا باہر آیا ہوا پیر باہر رہ گیا اور اندر کا اندر۔"

مفتی جی، سچ فرمائیں، یہ ہوئی نا بات!

مجھے شاید دو ہفتوں کے لیے امریکہ جانا پڑے، جواب جلدی فرمائیں۔ ابھی تو بہت باتیں ہیں، زخم ہیں، سوچیں ہیں، امیدیں ہیں جو آپ سے Communicate کرنی ہیں۔

سب کچھ ہے، پھر بھی کچھ نہیں۔ illusion کہہ لیں delusion کہہ لیں۔

آپ کا differ کرنے والا

نالائق شاگرد

مظہر

9-4-89

پیارے! تو سوچتا ہے کہ کیا ہونا چاہیے۔

میں سوچتا ہوں کہ کیا ہوتا ہے۔

تو oughts میں سوچتا ہے۔

میں Is میں سوچتا ہوں۔

جس میں وفا ہے اسے ہم محبوب نہیں بناتے۔ یہ Is ہے ought نہیں گوتم بدھ اللہ کا آدمی تھا۔

اللہ کے آدمی کسی اور رنگ میں سوچتے ہیں۔ oughts سے بھی ہٹ کر، تو نے اس کے اندرونی جذبات میں نہیں جھانکا۔ ویسے جہاں بات ہوگی۔ وہاں difference of opinion تو ہوگا۔ میں اختلافِ رائے کی عزت کرتا ہوں۔ اللہ تمھیں توفیق دے کہ کتاب لکھو۔

یہ لوگ جو غیر اللہ کو چھوڑ دیتے ہیں ان کی باتیں ہم پر لاگو نہیں ہوتیں۔ 30 سال ایک ایسے شخص کے ساتھ گزارے ہیں جو غیر اللہ کو چھوڑ چکا تھا۔ میں ان کی باتوں سے واقف ہوں لیکن میں نے انھیں اپنایا نہیں اس لیے کہ میں غیر اللہ سے بندھا ہوا ہوں۔ تم امریکہ سے ہو آؤ پھر جھگڑا کریں گے۔

ممتاز مفتی

(7)

لاہور

8اپریل 89ء

مفتی جی!

پرانے زمانے میں بندروں کو پکڑنے کا بڑا دلچسپ طریقہ دیکھا تھا۔ وہ یہ تھا کہ ایک بڑا کُجا لے کر جس کا منہ چھوٹا ہوتا، اس میں خوشبودار پھلّے لے کر رکھ دیتے۔ بندر آتا اور اپنا ہاتھ اس تنگ منہ کے برتن میں ڈال کر اپنی مٹھی پھلّوں سے بھر لیتا اور پھر ہاتھ نکالتا تو بھنچی ہوئی مٹھی کی وجہ سے نکال نہ سکتا اور پھنس جاتا۔ وہ سمجھتا میرے ہاتھ میں بہت کچھ آ گیا ہے کیوں چھوڑوں۔ چالاک ہونے کے باوجود وہ یہ نہ سمجھ پاتا کہ مٹھی کھول دوں۔ ہاتھ نکال لوں تو آزاد ہوں۔

اس زمانے میں یہ تماشا تھا پر آج سوچتا ہوں کہ میں اور میری طرح کے لوگ بالکل اس بندر کی طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ نفسانی خواہشات، لالچ، حرص وغیرہ نے ہمیں جکڑ رکھا ہے اور ہم نے پورے زور سے مٹھی بند کر رکھی ہے۔ مٹھی کھول کر ہاتھ نکال لیں تو liberation کتنی آسان ہے، لیکن thorn bird کی طرح سب کچھ جانتے بوجھتے لپک لپک کر کجے میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھینچے ہوئے ہیں۔

مٹھی کھولنا عقل سے کچھ اونچی بات ہے وہ عقل کیسے آئے۔

جب بھی مجھے کوئی ایسا خیال آتا ہے کہ آپ سے communicate کروں۔ فوراً لکھ دیتا ہوں۔ گر پوچھ رہا ہوں کہ آپ نے اپنی مٹھی کیسے نکالی؟

آپ کا

مظہر

RekhtaDownload.com

لاہور

22 اپریل

مفتی جی! اللہ والوں کی باتیں آپ سے نہ کروں تو کسی مولوی کے پاس جاؤں؟ وہ کہے گا: ''اپنا شیشے وچ منہ ویکھیا؟'' ...... ''کیہو جیاں گلاں کرنا ایں۔

شرم نہیں آندی، چل دفع ہو، لاحول ولاقوۃ''

خدارا انگلی پکڑ لینے دیں۔ چھڑائیں مت۔ منزل نہ سہی۔ منزل کے سہانے خواب تو دیکھنے دیں۔ قوس قزح تک پہنچ تو نہیں سکتے۔ اس کی طرف دیکھ تو سکتے ہیں۔ aspirations میں کیا گناہ ہے۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ کوئی انسان اپنے گناہوں کو مٹا کر، اپنی عبادات کے Claim پر اللہ کی رحمت حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ صرف اور صرف اللہ کی رحمت ہی ہے جو جس کو چاہے جس وقت چاہے، نواز دے۔ کہتے ہیں جو بندے سے اللہ کی طرف جاتا ہے وہ تو کچھ بھی نہیں اور نہ ہی اسے اس کی ضرورت ہے۔ اصل چیز تو وہ ہے جو اللہ کی طرف بندے کو آئے۔

اللہ بخشے میری ماں کہا کرتی تھی: ''رب ناں ڈانگیں لڑدا۔ مت کولی پا'' اب دیکھئے نا جب مت کولی پڑتی ہے تو انسان ہی ہے جو اٹھتا ہے۔ کہتا ہے ''چل یار، ڈاکہ ماریئے، کنجراں دے چلیے۔'' اور انسان ہی ہے کہ جب مت سیدھی ہوتی ہے تو مسجد کا رخ کرتا ہے۔ کسی حد تک خیالات بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ تبھی تو بزرگ لوگ دعا دیتے ہیں کہ

''اللہ تجھے نیک ہدایت دے'' اس کی رحمت کو جب منظور ہوتا ہے تو اسباب بھی خود بخود بنتے چلے جاتے ہیں اور صحیح سمجھ بھی عطا ہو جاتی ہے۔

ایک بہت جابر بادشاہ تھا۔ نام تھا اس کا ابراہیم آدھم کسی دن محل سے باہر تھا تو اس کی باندی اس کا بستر بنانے اس کی خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ سخت نیند آئی ہوئی تھی، بستر ٹھیک کرتے ہی اس پر سو گئی۔ اتفاق سے اسی وقت بادشاہ آدھمکا۔ باندی کی گستاخی سے غصے میں لال پیلا ہو کر فوراً ہنٹر کا حکم دیا اور مارنا شروع کر دیا۔ اب وہ ہنٹر مارتا تو وہ ہنستی۔ وہ اور زور سے مارتا تو وہ اور زور سے ہنستی۔ تھک گیا تو حیران ہو کر پوچھنے لگا۔ ''بدذات کی بچی۔ ایک تو تم نے گستاخی کی اور اوپر سے ہنٹر کھانے پر خوش ہوتی ہے۔''

بولی، ''ارے بادشاہ سلامت۔ میں تو خوش اس بات پر ہو رہی ہوں کہ اس بستر پر صرف تین منٹ سوئی تو مجھے اتنے ہنٹر مارے گئے لیکن جناب آپ کا کیا بنے گا۔ آپ تو ساری عمر یہاں سوتے رہے ہیں۔ آپ پر کتنے ہنٹر پڑیں گے۔

میرے جیسے گناہ گار جب ہیں ہی receiving end پر تو اللہ کی رحمت کی آس پر تو حوصلہ ہے۔

آج پامیلا کی بات نہیں ہو سکی۔ آج سے بیس تیس سال بعد وہ بوڑھی ہو جائے گی تو لوگ کہیں گے چل بڑھیا، پرے ہٹ تمہیں تو aids لگی معلوم ہوتی ہے۔

آپ کا

منظہر

6-5-89

مظہر، بہت سالوں کی بات ہے۔ ایک شخص مجھ سے انٹرویو کرنے آیا۔ کہنے لگا: صرف ایک سوال پوچھوں گا۔ فرض کرو تمھاری لائبریری میں بیس ہزار کتابیں ہیں۔ تمھارے مکان کو آگ لگ جاتی ہے تم صرف ایک کتاب اٹھا سکتے ہو بتاؤ کہ تم کون سی کتاب اٹھاؤ گے؟

میں نے کہا: ''تذکرۂ غوثیہ۔''

''تذکرۂ غوثیہ'' وہ کتاب ہے جس نے مجھے بتایا کہ بزرگ کسے کہتے ہیں کہ بزرگ ندی کی طرح نہیں ہوتا، دریا کی طرح نہیں ہوتا بلکہ سمندر کی طرح ہوتا ہے۔ اس میں پیشاب بھی کردو تو ناپاک نہیں ہوتا۔ ''لبیک'' میں میں نے لکھا تھا۔ اگر میرا رہبر ندی جیسا ہوتا تو مجھے پتہ چل جاتا کہ اس کا رخ کس سمت کی جانب ہے اور میں اس سمت کی طرف چل پڑتا لیکن رہبر وہ ملا جو سمندر کی طرح ہے نہ پتہ چلتا ہے کہ کدھر سے آرہا ہے کدھر کو جارہا ہے۔

کوئٹہ کے ایک بزرگ تھے۔ شاعر تھے۔ محشر نام تھا۔ وہ کوئٹہ سے چل کر اسلام آباد آئے۔ مجھ سے ملے۔ کہنے لگے: تمھارے ایک جملے نے ہمیں مجبور کردیا کہ تم سے ملنے اسلام آباد آئیں۔ ہمارا رہبر بھی سمندر جیسا تھا پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس جانب رخ ہے کس سمت کو رواں دواں ہیں۔

یقیناً تم نے ''تذکرۂ غوثیہ'' پڑھی ہوگی۔ نہیں پڑھی تو ابھی بازار جاؤ خریدو، پڑھو۔ یہ کتاب میرے موجودہ beliefs کا base ہے۔ یہ کتاب ذہن اور دل میں اتنی وسعت

پیدا کرتی ہے کہ بندہ پابندیوں کا قائل نہیں رہتا۔ پھر اسے چھوٹا موٹا بابا پسند نہیں آتا۔ پھر وہ دریاؤں کو بھی نہیں مانتا، سمندر مانگتا ہے، اور سمندر ملنے بے حد مشکل ہیں۔

اگر تم نے یہ کتاب پڑھی ہے تو ایک بار پھر پڑھو۔

اگر نہیں پڑھی تو پڑھو۔

جہاں تک طمع کا سوال ہے اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ دنیادار اس قدر طمع زدہ نہیں، جتنے بزرگ ہیں۔

ممتاز مفتی

RekhtaDownload.com

28-5

میرا پروگرام یہ ہے

یکم جون کو لاہور پہنچوں گا۔ رات کے وقت 2 جون اور 3 جون لاہور ٹھہروں گا۔ بانو کے گھر فون نمبر 854550 پر آپ سے ملوں گا۔ احمد بشیر کے گھر جاؤں گا۔ پروین سے ملوں گا۔ 4 کو صبح سویرے آپ مجھے فیصل آباد کی بس پر چڑھا دیں گے۔ فیصل آباد میں اماں نے مجھے بلایا ہے۔ اماں فیصل آباد میں دفن ہے۔ 5-6 جون میں فیصل آباد میں رہوں گا۔ 7 کو اسلام آباد واپس آ جاؤں گا۔ فیصل آباد میں میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔ ڈاکٹر امانت مفتی 714 بٹالہ کالونی میں رہتا ہے۔ اس کا فون نمبر 44370 ہے۔ آپ اسے فون کر کے بتا دیں کہ میں 4 کو پہنچوں گا۔ 5-6 اس کے پاس رہوں گا۔ اماں سے ملوں گا۔ اور 7 کو اسلام آباد آ جاؤں گا۔ یہ فائنل پروگرام ہے۔ اگر کوئی تبدیلی ہوئی تو فون پر بتا دوں گا۔

ممتاز مفتی

مورخہ 14 جون

پیارے مظہر، عام طور سے لوگوں کے دلوں میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ بزرگ سے ملیں، ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو جائیں۔ بیعت کرلیں پھر اللہ کے راستے پر چل پڑیں اور مرتبہ پائیں۔

پتا نہیں کیوں مجھ میں یہ خواہش کبھی پیدا نہیں ہوئی کہ بیعت کروں اور مرتبہ پاؤں۔

میانوالی کے ایک بزرگ نے دعویٰ کیا تھا کہ ہمارے پاس آؤ 41 دن ہمارے پاس رہو اور پھر ولایت لے کر واپس جاؤ۔

میں نے ان سے کہا: حضور آپ کے پاس بیٹھنا بے شک باعث برکت ہے لیکن میں ولایت کا طلب گار نہیں ہوں۔ میرے لیے ایک اچھا انسان بن کر جینا ہی مشکل ہے۔ ولایت تو اونچی بات ہے۔

میں نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ یہ بتایئے کہ ولایت کیا چیز ہے؟

انھوں نے کہا کہ ایک ٹوٹی پھوٹی کشتی دے دیتے ہیں اور ایک ٹوٹا پھوٹا چپو اور ایک وسیع سمندر میں چھوڑ کر کہتے ہیں کہ لو اب تمھاری ہمت ہے جتنی دور جا سکو، چلے جاؤ۔ میں تو اک کمزور انسان ہوں۔ چپو چلانے کی ہمت نہیں رکھتا۔ بندشیں برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں۔ اگر کوئی پکی پکائی بھی دے دے تو بھی اسے maintain کرنا پڑتا ہے۔ میں تو بزرگوں سے مل کر

RekhtaDownload.com

ان کی برکتیں سمیٹنے کا قائل ہوں اور بس۔ میری زندگی میں جتنی بھی آسانیاں ہیں، جتنی بھی برکتیں ہیں وہ سب بزرگوں کی دین ہیں۔ میں تو مفت خورہ ہوں۔ محنت مشقت کر کے حاصل کیا تو کیا کیا۔

پتا نہیں بزرگوں کے بارے میں تمھارا کیا رویہ ہے۔ ہر آدمی کا رویہ مختلف ہوتا ہے۔ ہر بزرگ کا ذائقہ مختلف ہوتا ہے۔ بزرگ بھی رنگ رنگ کے ہوتے ہیں۔ کوئی کڑوے کوئی میٹھے کوئی کھٹ مٹھے۔ اس بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟

ممتاز مفتی

مکان 22 گلی 32

ایف 6-1 اسلام آباد

RekhtaDownload.com

لاہور 26 جون

مفتی جی،

میں تو بزرگوں کا رخ اس وقت کرتا ہوں جب رونا آتا ہے۔ جیسے ڈوبتا آدمی تنکے کو ہاتھ مارتا ہے۔

واہ وا۔ ولائت کی تعریف خوب کی ہے۔ ٹوٹی پھوٹی کشتی، ٹوٹا پھوٹا چپو اور وسیع سمندر۔ غوث پاک نے کہا تھا کہ خدا کا راستہ وہ راستہ ہے جہاں نہ کوئی سمت ہے اور نہ کوئی دروازہ اور نہ ہی مخلوق۔ اور انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ اس وسیع سمندر میں کشتی شرع ہے اور ایمان چپو۔ میرے جیسے مفت خورے تو صرف فقیر بن کر ٹھوٹھا پکڑ کر صرف اس کی رحمت کے لیے صدا ہی دے سکتے ہیں۔ وہ سخیوں کا سخی کیا پتہ کس وقت نواز دے۔ ہے کوئی اسے روکنے والا یا پوچھنے والا؟ ولایت کے لیے نہیں، صرف معافی کے لیے۔

یہ بابے جو 41 دن میں ولائت دینے کا وعدہ کرتے ہیں یا بگڑے کام بنانے کی نوید سناتے ہیں، اللہ مجھے معاف کرے اچھے نہیں لگتے۔ بزرگ تو وہ ہیں جو تصرف فرما کر آپ کی آرزوئیں بدل ڈالیں۔ سیدھی پٹڑی پر چڑھا دیں۔

آپ نے سچ کہا۔ ایک اچھا انسان بننا ہی مشکل ہے۔ کریں کیا، آج کل کا social system ہی ایسا ہو چکا ہے کہ آدمی evil میں جکڑا محسوس کرتا ہے۔ میں تو ہر وقت اپنے کو جکڑ بھرا محسوس کرتا ہوں اور یہ بزرگوں کا topic میرے بس کی بات نہیں۔ اگر کچھ پڑھا بھی

ہے تو احساس ہوتا ہے کہ میں وہ گدھا ہوں جس پر کتابیں لاد دی گئی ہیں اور اسے ان سے متعلق کوئی ادراک نہیں۔

آپ کا

مظہر

RekhtaDownload.com

19 جولائی

مفتی جی،

ایک گاؤں میں ایک سادھو مہنت آیا۔ دھونی رچائی، خاک ملی اور نعرہ لگایا۔ کہنے لگا میں ایک ایسا منتر جانتا ہوں جس کو ہزار بار پڑھنے سے جھولی میں پڑا ہوا پیتل سونا بن جاتا ہے۔ پانچ پانچ سو روپیہ نکالو اور پیتل لے آؤ۔ اگر تمھارا پیتل سونا نہ بنے تو تمھارے روپے بھی واپس اور بے شک مجھے قتل بھی کر دینا۔ لوگ سیکڑوں ہزاروں میں اکٹھے ہو گئے۔ مہاتما نے روپوں سے بوری بھر لی۔ پھر جناب اس نے آئیں بائیں شائیں لالہ گت۔ کپت کت۔ گنگن سنگھ جیسی چیز ان کو یاد کرائی اور کہنے لگا کہ یہی وہ منتر ہے۔ ہزار بار پڑھو اور اپنی جھولی کی طرف دیکھو تو سونا پا لو۔ مگر ایک شرط ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ جب تم منتر پڑھنے میں مصروف ہو جاؤ تو تمھیں ''کالی بلی'' کا خیال نہیں آنا چاہئے۔ اگر کالی بلی کا خیال آ گیا تو تمھارا پیتل پیتل ہی رہ جائے گا۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے منتر پڑھنا شروع کیا تو سب صرف اور صرف کالی بلی کا ہی سوچ رہے تھے۔ کالی بلی ان پر چھا گئی اور ان کا پیتل سونا نہ بن سکا۔ سادھو مہاتما نے روپوں والی بوری اٹھائی اور چلتا بنا۔

آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے ''تذکرہ غوثیہ'' ایک دو تین دفعہ پڑھ لی ہے لیکن اس گاؤں کے لوگوں کی طرح ''کالی بلی'' نہیں بھولتی۔ دل صاف کیسے کیا جائے۔ دل سے کالی بلی کیسے نکلے۔

ایک حکایت میں پڑھا تھا:

ایک پہنچے ہوئے بزرگ جا رہے تھے۔ درخت پہ ایک خوب صورت پرندہ بیٹھا تھا۔ نیچے شکاری نے اس پرندے کو پکڑنے کے لیے جال بچھا رکھا تھا۔ بزرگ نے پرندے کو کہا: بھئی کیسے ہو؟ یہ نیچے دیکھ رہے ہو؟ پرندہ ہنسا، کہنے لگا۔ ہاہا اس بے وقوف شکاری کو یہ بھی پتا نہیں کہ مجھے اس کی چال کا علم ہے۔ خوامخواہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے میں اور اس کے جال میں پھنسوں؟ ہاہاہا...... کچھ عرصے کے بعد وہ بزرگ واپسی پر پھر وہیں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی پرندہ شکاری کے جال میں بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ کہنے لگے: یار تم تو بڑے چالاک بنتے تھے۔ کیسے پھنسے؟ پرندہ بولا۔ بات کچھ بھی نہیں، بس مت ماری گئی۔

مفتی جی! بس اسی طرح میری مت ماری رہتی ہے۔

مفتی جی، آپ کا افسانہ ''دیکھن دکھن'' پڑھا۔ خوشی کے پیچھے ایک temperament ہوتا ہے۔ عموماً عارضی اور بھدا، لیکن غم کے پیچھے مسلسل غم، خوشی نقاب پہنتی ہے۔ غم کا کوئی نقاب نہیں۔ خوشی illusion ہے اور غم سچائی یعنی reality۔

آپ کے افسانے ''دیکھن دکھن'' میں ہنواری اور جگن جوتشی کے احساسات کے ساتھ سفر کرتے کرتے میں ہوا میں اڑنے لگا۔ دونوں ''دیکھن دکھن'' کے مارے ہوئے غم کی نہ ختم ہونے والی راہوں پر تھے۔ بابا فقیرا نے reality بتا دی۔

''پتر یہ دکھن کا چکر ایک پردہ ہے۔''

''پتر وہ جو ڈال ڈال پات پات دکھتا ہے، جو ذرے ذرے میں دکھتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ہم اسے دیکھیں۔ اسی لیے اس نے ہمیں ''دیکھن دکھن'' کے چکر میں ڈال رکھا ہے۔''

مفتی جی، یہ بہت خوب صورت نچوڑ تھا جسے Concentrated wisdom کہہ لیں۔ کتنا اچھا ہوتا کہ آپ حسنہ کی واپسی کو گولی مارتے۔ اس چمگادڑ کو لا پھر ہنواری کی گود میں

بٹھایا۔ حسن حقیقی دکھا کر بھونڈے illusion میں پھر لوٹا دیا۔ کتنا اچھا ہوتا بابے فقیرے کے truth کے بعد بنواری اور جگن جوتشی کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے۔

ع کیا رخصت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے

آپ کا

مظہر

لاہور

RekhtaDownload.com

24-7-89

مظہر، کالی بلی ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔

کالی بلی ہر فرد کے دل میں بیٹھی ہے صرف تمھارے، میرے دل میں ہی نہیں۔ ہر کسی کے دل میں ہے۔ کیا تمھیں علم ہے کہ کششِ ثقل (gravity) نہ ہو تو پودے اگ نہ سکیں۔ اگر کالی بلی راستہ نہ کاٹے تو آگے جانا ناممکن ہو جائے۔ اگر دریا کا بہاؤ خلاف نہ ہو تو مچھلیاں آگے کی طرف نہ جا سکیں۔ اگر اللہ کے راستے پر چلنے والے کی راہ میں رکاوٹیں نہ ہوں، کالی بلیاں نہ ہوں تو آگے بڑھ نہ سکیں اگر اندھیرا نہ ہو تو چراغ کیسے جلے۔

جب شیطان تمھارا راستہ روکے تو تمھیں خوش ہونا چاہیے کہ وہ تمھیں اتنی اہمیت دیتا ہے۔ وہ صرف ان لوگوں کا راستہ روکتا ہے جن کے پہنچ جانے کا خطرہ ہے۔

''مت'' کوئی طاقت ور چیز نہیں ہے اس لیے اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہمیشہ ماری جاتی ہے۔ مت کے برعکس ایمان ہے یقین ہے، اس میں جان ہے قوت ہے، طاقت ہے اس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ اب تم چل پڑے ہو اور کالی بلیوں کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ تم پہنچ جاؤ گے اس لیے وہ چاروں طرف سے تمھیں گھیریں گی۔ اس پر تمھیں خوش ہونا چاہیے۔ ان کے حملے سے بچنے کا صرف ایک طریقہ ہے Ignore them۔ اسے صوفی لوگ کہتے ہیں Divine disdain۔ غصہ پیدا نہ ہو، چڑ نہ ہو، کسی قسم کا جذبہ پیدا نہ ہو، صرف ignore کرو۔ اہمیت نہ دو۔

اب رہی کہانی کی بات

تم ٹھیک کہتے ہو کہانی ان جملوں پر ختم ہو جاتی ہے۔

یہ کہانی صرف ان دو فقروں پر قائم کی گئی تھی۔

اگر وہاں کہانی ختم کر دیتا تو بھید کھل جاتا۔ لوگ کہتے اللہ کا پراپیگنڈا کر رہا ہے۔

اس بات کو چھپانے کے لیے لازم ہے کہ کہانی وہاں ختم نہ کی جائے۔ اس انجام کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اللہ کا پلان کامیاب ہے۔ اس کا پردہ قائم ہے، دیکھن دکھن کی illusion قائم ہے، دنیا قائم ہے، زندگی قائم ہے۔

سیانے کہتے ہیں: پریم اس زندگی کو ہرا بھرا (propagate) رکھنے کے لیے قدرت کی ایک چال ہے۔

ممتاز مفتی

RekhtaDownload.com

(قدرت اللہ شہاب پر بانو قدسیہ کی لکھی کتاب ''مرد ابریشم'' سے متعلق مفتی صاحب نے ٹیلی فون کیا اور کہا اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس پر Comments لکھ کر بھیجو۔)

25 جولائی

مفتی جی،

ایک دفعہ کوئی چھوٹی عمر میں ہی بہت بڑے ملک کا بادشاہ بنا۔ اس کے پاس ڈھیروں خزانے تھے اور عقل سیکھنے کا بھی شوق تھا۔ اس نے ملک کے سیانوں کو بلایا اور کہا کہ یہ لو ایک لاکھ اشرفی اور مجھے دنیا کی wisdom لا کر دو۔ اس وقت بادشاہ کی عمر پچیس تیس برس تھی۔ سیانے چلے گئے اور بادشاہ رموزِ سلطنت میں مصروف ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عیش و عشرت میں ڈوب گیا۔ شراب ناچ، گانے میں، دس سال گزر گئے۔ ایک شام وہ حسین محفل میں تھا کہ دربان نے آ کر کہا۔ ''جناب: باہر ایک سو اونٹ کھڑے ہیں، ان پر کتابیں لدی ہیں۔'' یہ وہی سیانے تھے جو دنیا کی wisdom ڈھونڈ کر لوٹے تھے۔ بادشاہ نے غصے میں کہا: ''جاہلو، میرے پاس سو اونٹوں پر لدی کتابیں پڑھنے کا وقت کہاں ہے۔ جاؤ یہ ایک لاکھ اشرفی اور لو اور اس علم کو کچھ مختصر کروا کے لاؤ۔ دس سال اور گزر گئے۔ بادشاہ بیگمات کی لڑائیوں، بچوں کی شادیوں اور وزیروں کی سازشوں میں پھنسا ہوا تھا۔ دربان آیا اور اطلاع دی: ''جناب باہر دس اونٹ کتابوں

سے لدے آئے ہیں۔" بادشاہ نے ان سیانوں کو پھر ڈانٹ پلائی: "ارے دیکھتے نہیں مجھے کیا کیا پریشانیاں ہیں۔ یہ اتنی کتابیں کیسے پڑھ سکتا ہوں۔ یہ لو ایک لاکھ اشرفی اور علم کو مزید مختصر کر کے لاؤ۔" پھر دس سال گزر گئے۔ اب کہ بادشاہ جنگ میں مصروف تھا۔ ساتھ والے بادشاہ نے پڑھائی کر رکھی تھی اور دن رات سلطنت چھن جانے کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ پھر وہ سیانے ایک اونٹ پر کتابیں لاد کر لائے تو اس نے کہا: "یار میرے پاس اتنا وقت کہاں، یہ لو پچاس ہزار اشرفی اور اس علم کو اور کم کرو۔" دس سال مزید گزر گئے۔ بادشاہ سلامت بیمار ہوئے بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے۔ دربان حاضر ہوا اور کہا: "جناب اس دفعہ کوئی اونٹ نہیں آیا۔ سیانے صرف ایک کتاب لائے ہیں لیکن بادشاہ میں ایک کتاب پڑھنے کی بھی اب ہمت باقی نہیں رہی تھی۔

بانو قدسیہ کی کتاب "مردِ ابریشم" پڑھ کر مجھے یہ کہانی یاد آئی۔ تمام عمر ہم سب کو ایسی concentrated wisdom کی تلاش رہتی ہے جو کاش ہمیں ایک کتاب میں مل جائے۔ بے شک "مردِ ابریشم" ایسی ہی کتابوں میں سے ایک ہے۔

کالج کے زمانے میں Words Worth کی شاعری میں کسی کی تنقید پڑھی تھی جو اتنی اچھی تھی کہ آج تک یاد ہے:

"Feeling comes in aid of feeling; thought comes in aid of thought; feeling and thought come in aid of each other and the poet having achieved the perfect integrity speaks the truth which is the universal truth."

یہی ریمارکس بانو قدسیہ کی اس کتاب پر فٹ ہوتے ہیں۔

یہ کتاب پیاری ہونے کے ساتھ ساتھ ڈھنگی بھی ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے بڑا مزا ہے جنہوں نے اللہ میاں کے فضل کی لاٹری کا ٹکٹ لے لیا ہو۔ کبھی شہاب صاحب کی زبانی کبھی اپنی زبانی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بانو نے جذبات کی سچائی کے حسن

RekhtaDownload.com

کے ڈھیر سارے موتی بکھیر کر رکھ دیئے ہیں۔ایک ایسے رخ کی نشان دہی کی ہے جہاں خیر ہی خیر ہو، خیر ہی خیر۔

علامہ اقبال کا شعر ہے:۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغ رہگزر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہگزر کو کیا خبر ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے بانو، شہاب صاحبؒ کی ساتھی، شہاب صاحب کی طرح درون خانہ پہنچ چکی ہیں۔شہاب صاحب سے متعلق تو آپ نے چابک اٹھا کر اس کا اعلان کر دیا تھا۔ان کا کیوں نہیں کرتے؟ لگتا ہے انھوں نے بھی اندر ایک ایسا سکون تلاش کر لیا ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔آیئے اس سمندر سے جواہر پارے اکٹھا کرنے کی کوشش کریں۔

''خوف دراصل خواہش سے جنم لینے والی کیفیت ہے جو لوگ دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں، خوف زدہ رہتے ہیں...... اللہ پر بھروسا رکھو۔''

''کیا اچھی عورت ہے، ہاتھ سے ٹاکی پھیرتی ہے اندر سے اللہ و سائیں کا ہاتھ پکڑے رکھتی ہے۔کہیں اسے ذکر کرنا آ جائے تو بیڑا پار ہو جائے۔''

''عفت کے ساتھ جو خوش گوار وقت گزارا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ میں شادی کر لوں لیکن اب جی نہیں چاہتا۔جب ایک بار بیڑی کٹ جائے تو دوبارہ قید ہونے کا مقصد؟ دائرہ ختم کر کے دوبارہ دائرے کا سفر کیوں؟''

مفتی جی، کوئی ایک بات ہو تو لکھوں۔کیا ساری کتاب ہی لکھ ڈالوں؟ یہ کتاب نہیں ایک خوب صورت باغ ہے جہاں خوشبوئیں ہی خوشبوئیں ہیں۔رنگ ہی رنگ۔دھیما دھیما دل کو لبھانے والا میوزک۔ایسے لگتا ہے بانو قدسیہ اونچے پہاڑ پر شہاب صاحب کے خوب صورت

بنگلے کے ساتھ اپنا بنگلہ بنا چکی ہیں۔

یہ رفعت کی تمنا ہے جو لے اڑتی ہے شبنم کو

آپ کا

مظہر

RekhtaDownload.com

مورخہ یکم اگست 89ء

مظہر، یہ علم و دانش والی کہانی بہت خوب ہے۔ میں نے یہ کہانی پہلے بھی سنی ہے لیکن اس کا انجام مختلف تھا۔ جب بادشاہ نے آخری بار سیانوں کو علم و دانش کی تلاش میں بھیجا تو سیانوں نے آپس میں مشورہ کیا، فیصلہ ہوا کہ دنیا کے سب سے بڑے دانش ور کو ملیں، اس سے پوچھیں: عالی جاہ علم و دانش کا نچوڑ کیا ہے؟

دانش ور نے ان کی ساری کہانی سنی۔ اس نے ایک ورق پر کچھ لکھا اسے لفافے میں بند کیا۔ کہنے لگا میں نے علم و دانش کا نچوڑ لکھ دیا ہے۔ تم یہ لفافہ اپنے بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دینا۔

سیانے وطن پہنچے اور وہ بند لفافہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بادشاہ نے لفافہ کھولا۔ لکھا تھا۔ علموں بس کریں او یار۔

سب سے پہلی عقل و دلیل کی بات ابلیس نے کی تھی۔ کہا تھا۔ باری تعالیٰ میں آگ کا بنا ہوا ہوں۔ یہ مٹی سے بنا ہے میں آدم کو سجدہ کیوں کروں۔

وزڈم باہر سے نہیں آتی، اندر سے پھوٹتی ہے۔ بشرطیکہ تمہارے پاس ایک sensitive receiver ہو۔

بانو کی کتاب کی کیا بات ہے۔

بانو کے پاس بڑا حساس ریسیور ہے۔

وہ ایک جنتی خاتون ہے۔ اس میں تین وصف ہیں۔ ٹھنڈی، میٹھی، خدمتی۔
''مردِ ابریشم'' سے میل نہ بھی ہوتا تو بھی جنتی تھی۔ اس رابطے نے اس کے ریسیور کو اور بھی جلا بخشی۔

بانو میری ماں ہے۔ اس نے مجھے بڑی ممتا دی۔

پھر یہ بھی ہے کہ اس نے میری بہت سی تلخی جذب کر لی۔ کتاب کے کچھ حصے چراغ راہ ہیں۔ کچھ بے تعلق ہیں۔

بانو کیا اچھی مصنفہ ہے، ایک ہاتھ میں قلم ہے، دوسرا ہاتھ اللہ وسائے کے ہاتھ میں دے رکھا ہے۔ اس کے لیے یہی راہ نجات ہے۔ چونکہ پتی بھگت ہے، شہاب یہاں بھی جھونپڑے میں رہتا تھا وہاں بھی کلی میں بیٹھا ہوگا۔ اسے بنگلے سے کیا لینا دینا۔

بانو بھی مزاجاً بوریہ نشین ہے۔

ان دونوں کے لیے یہاں وہاں میں کوئی فرق نہیں۔ اور فرق کیسے ہو، یہاں بھی وہ، وہاں بھی وہ۔ جو وہ کے طالب ہیں ان کے لیے کیا یہاں کیا وہاں۔

ممتاز مفتی

اسلام آباد

RekhtaDownload.com

22 اگست

مفتی جی،

کھلا آسمان اور سیاہ اندھیری رات ہو اس حدِ نظر Cosmos میں ایک جگنو صرف ایک ہی دفعہ ٹمٹمائے تو اندازہ کریں اس Time and Space میں انسان کی زندگی اس چھوٹے سے ٹمٹمانے سے بھی بہت بہت کم ہے۔

آپ نے کبھی سوچا ہے کہ ہماری پیدائش کا مقصد کیا ہے جبکہ اس چھوٹی سی زندگی میں ہزاروں سیاپے پلے پڑ جاتے ہیں۔ سکول، کالج، امتحان، مزدوری، نفرتیں، جنگیں، غم، بیماری، محبت، ممتا۔

زندگی کا سفر کار میں سفر کرنے کی طرح ہے۔ کبھی سڑک سیدھی ہے، کہیں موڑ ہیں، کہیں چڑھائی ہے، کبھی اترائی، کبھی سڑک صاف ہے، کبھی rough، کہیں پل ٹوٹے ہوئے ہیں اور کہیں bye pass۔ ذرا سا راستہ بھولو تو ریگستان میں پہنچ سکتے ہیں۔ دلدل میں اتر سکتے ہیں۔

مفتی جی، یہ time and space کے لحاظ سے اتنی قلیل مدت میں اتنا کچھ؟ یہ کیوں ہے؟ اس کا مقصد؟

یہ مثال سچ لگتی ہے کہ یہ دنیا ایک stage ہے اور ہم سب ایکٹر ہیں۔ ہمارا رول لکھا جا چکا ہے، کہانی لکھی جا چکی ہے۔ ہمیں costumes تک پہنچائی جا چکی ہے۔ ”دیکھنے والا“

صرف یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم act کیسے کرتے ہیں۔ کیا یہ سب امتحان ہے یا ''اس'' کا مقصد ہے کہ ''مجھے پہچانو''۔

''اپنا حال تو ریلوے اسٹیشن کی اس لنگڑی کتیا کی طرح ہے جو ہر روز سوٹھڈے کھاتی ہے لیکن کبھی کبھی ایک آدھ بچا بچایا روٹی کا بھورا مل جاتا ہے تو سٹیشن نہیں چھوڑتی۔ ٹھوڈے کھاتی ہے، مار کھاتی ہے، پر پھر وہیں کی وہیں۔ اس کے لیے اسٹیشن ہی اس کی کائنات ہے، دراصل اس کی سوچ ہی اتنی ہے۔

مفتی جی، غم میں bitterness کو ختم کیسے کیا جا سکتا ہے؟

آپ کا غلام

مظہر

RekhtaDownload.com

16-9-89

مظہر، یہ سراسر زیادتی ہے۔

سیانے کہتے ہیں کہ یا تو بھروسا نہ کرو، اور اگر کرو تو کرو۔ پھر ہچکچاہٹ کیسی۔

تمہیں چاہیے تھا کہ مجھے ساری بات لکھتے، کیا ہوا۔ مجھ سے بات چھپا گئے۔

اب پوچھ رہے ہو کیا کروں، کیسے اس دلدل سے باہر نکلوں۔

اونہوں ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی۔

شرم کرو۔

ممتاز مفتی

RekhtaDownload.com

RekhtaDownload.com

انوکھے عشق اور واقعات

انوکھے عشق

انسان بجاطور پر جاننا چاہتا ہے کہ خدا جس کی میں عبادت کرتا ہوں، جس نے مجھے پیدا کیا، جو مجھے رزق دیتا ہے، جس کے ہاتھ میں میرا بھلا اور برا ہے، جو مجھے موت دے گا، انعام دے گا یا سزا، آخر وہ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ اس سے ملنے کا راستہ کون سا ہے؟ اس کو خوش کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اس سوچ یا کوشش میں سب اپنی اپنی ڈگر پر چل رہے ہیں۔

RekhtaDownload.com

چرواہا

مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کی ایک حکایت کا ترجمہ یوں ہے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دن جنگل میں جا رہے تھے کہ انھوں نے ایک چرواہے کی آواز سنی۔ وہ اونچی اونچی کہہ رہا تھا: ''اے میرے جان سے پیارے خدا، تو کہاں ہے؟ میرے پاس آ۔ میں تیرے سر میں کنگھی کروں، جوئیں چنوں۔ تیرا لباس میلا ہو گیا ہے تو دھوؤں۔ تیرے موزے پھٹ گئے ہوں تو وہ بھی سیئوں۔ تجھے تازہ تازہ دودھ پلاؤں۔ تو بیمار ہو جائے تو تیری تیمارداری کروں۔ اگر مجھے معلوم ہو کہ تیرا گھر کہاں ہے تو تمھارے لیے روز گھی اور دودھ لایا کروں۔ میری سب بکریاں تم پر قربان اب تو آ جا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے قریب گئے اور کہنے لگے: ''ارے احمق، تو یہ باتیں کس سے کر رہا ہے؟'' چرواہے نے جواب دیا۔ ''اس سے کر رہا ہوں جس نے تجھے اور مجھے پیدا کیا اور یہ زمین آسمان بنائے۔'' یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غضب ناک ہو کر کہا: ''ارے بد بخت، تو اس بے ہودہ بکواس سے کہیں کا نہ رہا۔ بجائے مومن کے تو تو کافر ہو گیا۔ خبردار ایسی بے معنی اور فضول بکواس بند کر۔ تیرے اس کفر کی بدبو ساری دنیا میں پھیل گئی۔ ارے بیوقوف، یہ دودھ، لسی ہم مخلوق کے لیے ہیں۔ کپڑوں کے محتاج ہم ہیں۔ حق تعالیٰ ان حاجتوں سے بے نیاز ہے۔ نہ وہ بیمار پڑتا ہے نہ اسے تیمارداری کی ضرورت ہے۔ نہ اس کا کوئی رشتے دار ہے۔ توبہ کر اور اس سے ڈر۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غیظ و غضب میں بھرے ہوئے یہ الفاظ سن کر چرواہے کے اوسان خطا ہو گئے۔ خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ بولا: ''اے خدا کے جلیل القدر نبی، تو نے ایسی بات کہی کہ میرا منہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا اور مارے ندامت کے میری جان ہلاکت میں پڑ گئی۔'' یہ کہتے ہی چرواہے نے سرد آہ کھینچی۔ اپنا گریبان تار تار کیا اور دیوانوں کی طرح اپنے سر پر خاک اڑاتا ہوا غائب ہو گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام حق تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے لیے کوہ طور پر گئے تو خدا نے فرمایا: ''اے موسیٰ! تو نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کیوں کیا؟ تو دنیا میں جدائی کے لیے آیا ہے یا ملاپ کے لیے؟ خبردار اس کام میں احتیاط رکھ۔ ہم نے اپنی مخلوق میں ہر شخص کی فطرت الگ بنائی ہے اور ہر فرد کو دوسروں سے جدا عقل بخشی ہے جو بات ایک کے حق میں اچھی ہے وہ دوسرے کے لیے بری ہے۔ ایک کے حق میں تریاق کا اثر رکھتی ہے وہی دوسرے کے لیے زہر ہے۔ ایک کے حق میں نور، دوسرے کے حق میں نار۔ ہماری ذات پاکی و ناپاکی سے مبرئی ہے اور اے موسیٰ، یہ مخلوق ہم نے اس لیے پیدا نہیں فرمائی کہ اس سے ہماری ذات کو کچھ فائدہ پہنچے۔ اسے پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس پر ہم اپنے کمالات کی بارش کریں۔ جو شخص جس زبان میں بھی ہماری حمد و ثنا کرتا ہے اس سے ہماری ذات میں کوئی کمی بیشی واقع نہیں ہوتی۔ مدح کرنے والا خود ہی پاک صاف ہوتا ہے۔ ہم کسی کے قول اور ظاہر پر نگاہ نہیں رکھتے۔ ہم تو باطن اور حال دیکھتے ہیں۔

اے موسیٰ، خردمندوں کے آداب اور ہیں۔ دل جلوں اور جان ہاروں کے آداب اور۔''

حضرت موسیٰ نے جب خدا کا یہ عتاب آمیز خطاب سنا تو سخت پشیمان ہوئے اور بارگاہِ الٰہی میں نہایت ندامت اور شرمساری سے معافی مانگی۔ پھر اسی اضطراب اور بے چینی میں اس چرواہے کو ڈھونڈنے جنگل میں گئے۔ صحرا و بیابان کی خاک چھان ماری پر چرواہے کا کہیں

پتا نہ چلا۔ اس قدر چلے کہ پیروں میں چھالے پڑ گئے لیکن تلاش جاری رکھی۔ آخر آپ اسے پالینے میں کامیاب ہوئے۔

چرواہے نے انھیں دیکھ کر کہا: ''اے موسیٰ، اب مجھ سے کیا خطا ہوئی کہ یہاں بھی آ پہنچے؟''

حضرت موسیٰ نے جواب دیا۔ ''اے چرواہے، میں تجھے مبارک دینے آیا ہوں۔ تجھے حق تعالیٰ نے اپنا بندہ فرمایا اور اجازت عطا کی کہ جو تیرے جی میں آئے بلا تکلف کہا کر۔ تجھے کسی ادب آداب، قاعدے ضابطے کی ضرورت نہیں۔ تیرا کفر اصل دین ہے اور دین نورِ جاں۔ تجھے سب کچھ معاف ہے بلکہ تیرے صدقے میں تمام دنیا کی حفاظت ہوتی ہے۔''

چرواہے نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: ''اے پیغمبرِ خدا، اب میں ان باتوں کے قابل ہی کہاں رہا ہوں کہ کچھ کہوں۔ میرے دل کا خون ہو چکا ہے، اب میری منزل بہت آگے ہے۔ تو نے ایسی ضرب لگائی کہ ہزاروں، لاکھوں سال کی راہ طے کر چکا ہوں۔ میرا حال بیان کے قابل نہیں اور یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے بھی میرا احوال مت جان۔

مولانا رومی اس حکایت سے ماحاصل یہ نکالتے ہیں کہ اے شخص جو تو حق تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہے کیا سمجھتا ہے؟ تو تو ابتدا سے انتہا تک ناقص اور تیرا حال و قال بھی ناقص۔ یہ محض اس پروردگارِ رحمٰن و رحیم کا کرم ہے کہ وہ تیرے ناقص اور گندے تحفے کو قبول فرماتا ہے۔

سرمد شہید

RekhtaDownload.com

اس matter of fact زمانے میں بھی کبھی کبھی چونکا دینے والی باتیں ہو جاتی ہیں۔ یہ واقعہ مجھے ایک 80 سالہ ہندو نے سنایا جو پڑھا لکھا ہے اور مذہب میں یقین نہیں رکھتا۔ اس کا نام آنند ہے اور international labour organisation میں سینئر عہدے پر فائض ہے، اسی کی زبانی سنئے:

''بہت سال پہلے جب سردار بلدیو سنگھ ہندوستان میں فیڈرل وزیر تھے اور میرے جگری دوست تھے، کہنے لگے کہ میرے ساتھ tour پر روپڑ چلو۔ دہلی سے نکلتے وقت کہنے لگے: سرمد شہید کے مزار سے ہوتے چلتے ہیں۔ ذرا بابا جی کو سلام کرتے چلیں۔ ہم عقیدت سے سلام کر کے مزار سے نکل رہے تھے تو وہاں ایک آدمی جھاڑو دے رہا تھا۔ اس نے ہمیں ٹھہرایا اور جھاڑو کی ہوئی تھوڑی سی مٹی کاغذ میں ڈال کر پڑیا بنا کر سردار صاحب کو تھما دی۔ کہنے لگا: اسے حصول برکت کے لیے رکھ لیں۔ سردار صاحب نے از راہِ مروت وہ پڑیا واسکٹ کی جیب میں رکھ لی۔

روپڑ میں کھانے کے بعد رات کو ابھی ٹیبل پر ہی بیٹھے تھے تو ان کو وہ پڑیا یاد

آ گئی۔ کہنے لگے: اس کا کیا کروں۔ ہم نے سوچا۔ اس کو پانی کے گلاس میں ڈال دیتے ہیں اور پھر فلش میں بہادیں گے۔ مٹی کو جب گلاس میں الٹا گیا تو ہم دم بخود رہ گئے۔ پانی یکا یک تازہ گاڑھے خون میں تبدیل ہو گیا۔ ساتھ ہی بجلی بجھ گئی۔ ہم بہت ڈر گئے۔ پانچ منٹ کے بعد بجلی واپس آئی تو ہم نے وہ گلاس بڑے احترام کے ساتھ پلیٹ پر رکھا اور دریا پر جا کر عزت کے ساتھ پانی میں بہا دیا۔ ساری رات کانپ کانپ کر گزاری۔ سرمد شہید کے مزار سے مٹی کی اس کرامت میں مجھے کوئی شک نہیں۔"

سرمد شہید کی نہ ختم ہونے والی ایک لمبی داستان ہے۔ جس کے خاکے کچھ یوں ہیں۔ وہ ایران سے تھے اور آغاز عمر ہی میں آتش پرست سے مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کے حسب نسب کا کسی کو کوئی مستند علم نہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو گم نام رہتے ہیں۔ جنھیں کوئی نہ جانے۔ اگر مریں تو آنسو بہانے والا کوئی نہ ہو۔ یعنی بے نام ونشانی ان کا ایمان تھا۔

باوجودت زمن آواز نیامد کہ منم

In thy presence I cannot even say "I am here."

ابتدائی پیشہ تجارت تھا۔ ٹھٹھہ جو ان دنوں سندھ کا مشہور شہر تھا۔ وہاں ایک ہندو لڑکے کی آنکھ میں نہ جانے کیا دیکھا کہ عشق کی ایک ہی چوٹ میں سب کچھ بھول گئے۔ کہتے ہیں عشق حقیقی کا دروازہ یہیں سے کھلتا ہے۔

افسردہ را نصیب نبا شد دلِ کباب
آن یا بداین نوالہ کہ مہمانِ آتش است

It is not the fortune of the faint hearted
To suffer in Love
Suffering is for those
Who walk in the flames of Love.

عشقِ الٰہی کی پہلی شرط یہ ہے کہ ماسوا کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ لیکن یہ بڑا ہی مشکل کام ہے۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب چوٹ سے جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ کہتے ہیں یہ طاقت صرف عشق کے فرشتہ کے بازوؤں ہی میں ہے۔ سرمد نے یہی چوٹ کھائی اور صحرا کا رخ کیا۔ نہ گرمی کا خیال نہ پاؤں کے چھالوں سے الجھن۔

جب عشق آتا ہے تو عقل و حواس سے کہتا ہے کہ میرے لیے جگہ خالی کر دو۔ سرمد پر بھی یہی حالت طاری ہو چکی تھی۔

خطا بمردم دیوانہ کسی نمی گیرد
جنوں نداری و آشفتہ ای خطا اینجانب

There is no fault
with a mad man
The fault lies in you
Love hasnt maddened you yet.

سرمد جب مدتوں صحرا کی خاک چھان چکے تو یہ عقدہ کھلا:

بے ہودہ چرا در طلبش می گردی
بنشین اگر او خداست خودمی آید

Why do you wander in the wilderness
Looking for Him?
Sit still. If he is Khuda
He will appear on His own

جنوں کی قیمت کون لگا سکتا ہے۔ لوگوں کو کیا خبر کہ دنیا میں ایسے ترازو بھی ہیں جن کے ایک پلے میں اگر دیوانگی رکھ دی جائے تو دوسرا پلہ تمام عالم کی ہوشیاری رکھ دینے سے بھی

نہیں جھک سکتا۔ اس بے خودی کے عالم میں سرمد کی دولت کھس گئی۔ جائداد کا پتا نہ رہا۔ آ جا کر اپنا لباس تھا وہ بھی اتار پھینکا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ دور میں شاہ جہانی حکومت ختم ہونے کو تھی اور شہزادہ دارا شکوہ ولی عہدِ سلطنت تھا مگر عالم گیر کسی صورت تخت کو حاصل کیے بغیر دم لینے کو تیار نہ تھا۔ دارا شکوہ صوفیانہ دل ودماغ رکھتا اور درویش دوست تھا۔ لہٰذا سرمد سے دوستی ہو گئی جو عالم گیر کو پسند نہ آئی۔ بالآخر جب دارا شکوہ اور اس کے بیٹے کو قتل کر دیا گیا اور عالم گیر شہنشاہ ہند بن چکے تو سرمد کی باری آئی۔ ان پر پہلا الزام تھا کہ یہ ننگے رہتے ہیں جو شرع میں جائز نہیں۔ عالم گیر نے ایک عالم کو اس کا سبب پوچھنے بھیجا تو سرمد نے کہا:

دز دی عجبی برہنہ کردہ است مرا

What a strange thief

He has stripped me of my

garments.

بادشاہ نے کہا: محض برہنگی وجہِ قتل نہیں ہو سکتی۔ اس سے کہا جائے کلمہ طیبہ پڑھے۔ بادشاہ سن چکا تھا کہ سرمد جب کلمہ طیب پڑھتا ہے تو لا الہ سے زیادہ نہیں کہتا۔ علما نے سرمد سے کلمہ پڑھنے کی خواہش کی۔ تو اس نے حسبِ عادت لا الہ پڑھا۔ علما نے شور مچا دیا تو سرمد نے کہا: میں تو ابھی نفی میں گم ہوں، اثبات تک نہیں پہنچا۔ جھوٹ کیوں بولوں۔ پھر کیا تھا، علماء نے فتویٰ دے دیا کہ اگر یہ توبہ نہیں کرتا تو قابلِ قتل ہے۔ سرمد نے توبہ سے انکار کیا تو دوسرے دن قتل گاہ پہنچا دیے گئے۔ جب جلاد تلوار چمکاتا ہوا آگے بڑھا تو مسکرا کر نظر ملائی اور کہا:

''فدائے تو شوم بیا بیا کہ تو بہر صورتی کہ می آئی من ترا خوب می شناسم''

Come

O come, I implore you

In whatever guise you come

I know you well.

یہ شعر پڑھا اور تلوار کے نیچے سر رکھ کر جان دے دی۔ لوگ کہتے ہیں کہ شہادت پانے کے بعد کٹے سر سے تین بار اللہ کی صدا بلند ہوئی۔ آج اس کے مزار کی مٹی سے تازہ خون ابلتا ہے۔

RekhtaDownload.com

بابا بلھے شاہ

بابا بلھے شاہ سے کون واقف نہیں۔ عشقِ الٰہی میں روحانی واردات ان کے کلام میں اکثر واضح ہیں۔ ذرا یہ ملاحظہ فرمائیے۔

پھوک مصلّے بھن سٹ لوٹا
نہ پھڑ تسبیح، عاصا، سوٹا
عاشق کہندے دے دے ہوکا
ترک حلالوں، کھاہ مردار
عشق دی نویوں نویں بہار

اسے پڑھ کر کوئی عالم تو شاید لاحول پڑھے لیکن کون جانے اس وقت ان کی کیا کیفیت تھی۔ شرع کی حلال چیزوں کو بھی چھوڑ کر وہ بھوک کی اس حالت میں پہنچ جانے کے بعد مردار کو بھی حلال ہو جانا سمجھتے ہوں یا مردار سے مراد غم کھانے سے ہو جو قربِ الٰہی کا سبب بنتا ہو۔

یہ انوکھے عشق ان لوگوں نے کیے جو پاک تھے اور فنا کی حد تک پہنچ چکے تھے۔

لیکن کسی بزرگ نے کہا ہے کہ ان عجائبات وتجلیات سے گزر کر جب انسان شریعت کی سیدھی، سادا اور خشک راہ پر گامزن ہوتا ہے تو یہی اس کی نیت کا پھل اور سب سے بڑا انعام ہے۔ اس راہ پر قدم رکھنے کے بعد انسان گزرے ہوئے عجائبات کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اللہ کو خوش کرنے

کا صحیح طریقہ اللہ کے نبیوں کی بتائی ہوئی ڈگر پر چلنے ہی سے ملتا ہے۔

میرے جیسے گناہ گار منہ زبانی مسلمان جن کے اندر لالچ، حسد اور خواہشات کا ڈھیر بھی ہے اور شریعت کی خواہش بھی۔ نصف فرشتہ نصف حیوان، نصف سانپ اور نصف مچھلی۔ مچھلی پانی کی طرف کھینچتی ہے اور سانپ خاک کی طرف۔ ایک کینسر کی طرح اس کشمکش میں مبتلا ہیں۔

RekhtaDownload.com

بوڑھوں کا رومانس

بوڑھے بھی آخر انسان ہوتے ہیں۔ گورنمنٹ سروس سے ریٹائر ہوئے ابھی مجھے سال بھی نہیں ہوا تھا۔ شیشہ دیکھتے وقت اکثر سوچتا کہ کاش عمر پانچ سال کم لکھوادی ہوتی۔ اپنی شکل دیکھتے وقت یہ غلط فہمی اکثر ہر ایک کو ہو جاتی ہے۔

شروع سے عادت ہے کہ کھانا چھوٹ جائے تو چھوٹ جائے پر باغ کی سیر نہیں چھوڑنی۔ عام طور پر صبح صبح ہی فارغ ہو لیتا ہوں۔ ایک دن صبح کی سیر مس ہو گئی تو دوپہر کے بعد علت پوری کرنے کو نکلا۔ اکیلا ہی چلے جا رہا تھا کہ ایک plumpish سی لڑکی جاگنگ کرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ تھوڑی دور جا کر تھک گئی اور slow ہو گئی۔ پھر تیز بھاگنے لگی اور پھر slow ہو گئی۔ میں نارمل چلے جا رہا تھا اور وہ رہ جاتی یا کبھی آگے نکل جاتی۔ ایک کلومیٹر فاصلہ جب یوں طے ہوا تو مجھے اتنی چڑ چڑھی کہ مجھ سے رہا نہ گیا اور کہہ ہی ڈالا: ''بی بی، اگر آپ نے اپنا وزن کم ہی کرنا ہے تو خدا کے لیے تیز چلیں اور چلتے جائیں۔''

یہ کہہ کر میں نے سوچا یہ ایک نیک کام کیا ہے۔ نیک کام کیا کیا کہ لڑکی نے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ بولی: ''آپ کو تو slimming کے راز آتے ہیں۔ ذرا تفصیل سے سمجھائیں۔''

میرے اندر انجانی خوشی کی لہر دوڑ گئی اور لمحے کے لیے بھول گیا کہ میں 60 سالہ

انسان ہوں۔ میرے سر میں انا ایسے گھسی کہ میں وہاں کھڑا ہو گیا۔ اچھل اچھل کر جاگنگ کے وہ بے ہنگم طریقے بتانے لگا جو نہ میں نے کبھی دیکھے اور نہ ہی سنے تھے۔ حیرت یہ ہوئی کہ اس لڑکی نے بھی میری کاپی کرنی شروع کر دی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ شکر ہے اس وقت وہاں کوئی اور سیر کرنے والے موجود نہ تھے۔ یوں ہچکولے کھاتے ہم خود ساختہ استاد شاگرد ایک bench تک پہنچ گئے۔

bench پر لڑکی نے لیٹ کر ٹانگوں، بازوؤں اور پیٹ کی exercises شروع کر کے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: ''میری ایک سہیلی نے یہ ورزشیں بتائی ہیں۔ ان میں کیا improvement ہو سکتی ہے؟'' اس کے پوچھنے کا انداز کچھ ایسے تھا جیسے میں ایک بہت بڑا expert ہوں۔ میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ یہ لڑکی abnormal ہے۔ اب میں یہاں سے بھاگوں۔ جاتے جاتے میں نے اس سے سوال کیا: ''آخر تمھیں کیا تکلیف ہے کہ slimming کے لیے پاگل ہوئی جا رہی ہو۔'' اس نے فوراً اپنا سوال داغ دیا: ''آپ کا کیا خیال ہے میری عمر کتنی ہے؟'' میں نے کہا یہی کوئی تیس پینتیس کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ ہنس پڑی۔ کہنے لگی:

''میں بڑی دکھی عورت ہوں۔ دیکھیں میں کتنی جلدی بوڑھی لگنی شروع ہو گئی ہوں۔ دراصل میری عمر 26 سال ہے۔ میرے خاوند کی عمر 45 سال ہے اور میں اس کی دوسری بیوی تھی۔''

''کیا کسی مجبوری کی وجہ سے شادی کی؟'' میں نے پوچھا۔

کہنے لگی: ''نہیں جناب یہ میری love marriage تھی لیکن افسوس اور دکھ کی بات یہ ہے کہ میرے خاوند کی پہلی بیوی سے کئی بچے ہیں لیکن میرے لیے بچہ جننا سختی سے منع کیا گیا۔ حالات بگڑنے لگے اور اب مجھے خاوند سے الگ ہی سمجھیں۔''

''تمھیں support کون کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ اس نے اپنا ایڈریس اور ٹیلیفون نمبر بتایا۔ میری اپنی

کار ہے۔ نوکر چاکر ہیں۔ گھر بھی اپنا ہے۔''

چلتے ہوئے میں نے کہا: ''خدا پر بھروسا رکھو۔ ہمت سے کام لو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ذرا رکیے، آپ مجھے بڑے شفیق اور اچھے انسان لگتے ہیں۔ کیا میں کل آپ کو اسی وقت مل سکتی ہوں؟'' اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''میری کل صبح کی سیر پھر مس ہوگئی تو شاید۔'' میں نے جاتے ہوئے کہا۔

اب میں گھر واپس آرہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ اس لڑکی سے رومانس ہو سکتا ہے۔ بہت لوگ disciplined ہوتے ہیں۔ ایسی فضولیات کی possibilty تو کیا وہ اس قسم کی حرکت کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ فرشتہ قسم کے لوگ یا سوسائٹی میں اونچی ناک رکھنے والے شرفا۔ لیکن افسوس میں فرشتہ تو ہوں ہی نہیں اور disciplined ہوں تو وہ بھی معمولی قسم کا۔ تھوڑی دکھاوے کی شرافت ضرور ہے۔ اس حد تک کہ کم از کم پکڑے نہیں جانا چاہیے۔ اسی سوچ کی پھانسی پر چڑھا ہوا تھا کہ اچانک مجھے گوئٹے جیسی مشہور شخصیت کا خیال آگیا۔ وہ 70 برس کا تھا تو اس نے ایک 18 سالہ کی لڑکی سے محبت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لڑکی اس سے زیادہ اس کی شہرت پر مرتی تھی۔ جب لڑکی کے ماں باپ کو پتا چلا تو انھوں نے گوئٹے کو بہت برا بھلا کہا۔ اس کی شہر میں اتنی بدنامی ہوئی کہ وہ شہر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ کہیں چھپا رہا اور اس لڑکی کے نام ناول اور نظمیں لکھتا رہا۔ بہت بوڑھا ہو کر جب مرنے کے قریب تھا تو بہت رویا اور اپنا دکھڑا یوں sum up کیا۔

It is not the failing faculties

mental or physical

which make old life miserable

it is the burden of memmories.

اگر گوئٹے جیسا باعزت انسان یہ حرکت کر سکتا ہے تو میرا تو بالکل معصوم

سا معاملہ ہے۔ میں نے دوسرے دن دوپہر کے بعد پھر آنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرے روز جان بوجھ کر آدھا گھنٹا لیٹ پہنچا۔ خواہش تھی کہ آج وہ ملے ہی نہ۔ ایسی کی تیسی، اس عمر میں یہ کیا بکواس ہے۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ سامنے میرا انتظار کر رہی تھی۔ میرے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ میں نے کہا: ایسے ساتھ چلنا کچھ ٹھیک نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔ ''ہم کو کسی کی کیا پرواہ ہے؟'' وہ بولی۔ میں نے کہا: ''بھئی تمھیں نہ ہوگی لیکن مجھے بہت پرواہ ہے۔ میرے بہت جاننے والے ہیں، دوست ہیں۔ میری لارج فیملی ہے۔ کوئی بھی دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔''

''کیا فرق پڑتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ پھر ایک bench آ گیا تو وہ وہاں بیٹھ گئی۔ لیکن میں کھڑا رہا۔

''آپ بھی بیٹھیں اور مجھ سے باتیں کریں۔'' اس نے دوبارہ دہرایا۔ ادھر میرے دماغ کے computer نے نہایت تیزی سے کام شروع کر دیا۔

وہ کچھ باتیں کر رہی تھی تو میں بغیر سنے سوچنے لگ پڑا۔ ''گوئٹے جرمن تھا۔ بھاڑ میں جائے۔ میں پاکستانی ہوں۔ اب مجھے میرے نہایت شفیق دوست ممتاز مفتی یاد آ گئے۔ جب وہ 65 برس کے تھے تو ایک 30 سالہ لڑکی سے ان کا آخری عشق یاد آ گیا۔ جس پر وہ ہزار جان سے فدا ہو گئے تھے۔ (میں ان کا راز فاش نہیں کر رہا بلکہ وہی دہرا رہا ہوں جو وہ اپنی قلم کے سپرد کر چکے تھے)

جس لڑکی کو وہ چاہ رہے تھے اس کا سب سے بڑا مسئلہ اپنے لیے نوکری ڈھونڈنا تھا۔ مفتی صاحب اس کے لیے عرضیاں لکھتے اور صبح صبح اس کو اپنے سکوٹر کے پیچھے بٹھا کر دفتر دفتر گھومتے۔ اور تو اور ایک دفعہ وہ اسے اپنے بیٹے عکسی مفتی کے دفتر بھی لے پہنچے۔ شاید اس کے گھر میں استعمال کے لیے سبزی گوشت بھی لا دیتے ہوں۔ آج کل اچھا گھریلو نوکر ملنا ایک عذاب ہے۔ اول تو ملتا نہیں اگر کہیں سے مل بھی جائے تو تھوڑے ہی دنوں کے بعد ماتھا پیٹنے کو دل چاہے

گا۔ایسے حالات میں اگر کسی لڑکی یا عورت کو ممتاز مفتی جیسا سیانا بے ضرر اور بن دام خدمت گزار مل جائے تو اسے اور کیا چاہیے۔ ممکن ہے لڑکی کو بھی مفتی صاحب سے محبت ہو گئی ہو مگر یہ مفت خدمت کی سہولت کو کون چھوڑ سکتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مفتی جی کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ ادھر اشفاق صاحب اور بانو قدسیہ جیسے دوست سمجھا سمجھا کر تھک گئے۔ معاملہ آخر قدرت اللہ شہاب صاحب تک پہنچا۔ مفتی صاحب خود نالاں تھے۔ بقول مفتی صاحب کے شہاب صاحب نے انھیں روزانہ ایک وظیفہ پڑھنے کی ہدایت کی۔

ہر شام مفتی صاحب نے وظیفہ شروع کر دیا۔ مقصد تھا کہ یا اللہ اس آخری عشق میں اس لڑکی سے جان چھوٹ جائے۔ آخر مفتی صاحب کی جان یوں چھوٹی کہ لڑکی کو ملک سے باہر کوئی Job مل گئی اور یوں قصہ ختم ہوا۔

میں نے کھڑے کھڑے فیصلہ کر لیا۔ نہ تو میں نے اپنا ریکارڈ لگوانا ہے نہ ہی میں نے بن دام اس لڑکی کی ملازمت کرنی ہے۔ نہ میں نے گوئٹے کی طرح دکھی ہونا ہے اور وظیفہ کرنا وہ بھی لڑکی سے چھٹکارے کے لیے اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وہ لڑکی ابھی کچھ بولے جا رہی تھی کہ میں نے کہا:

"دیکھو، خاوند سے صلح کی کوشش کرو۔ فگر کے لیے slimming کی classes جائن کرو۔ خدا پر بھروسا رکھو۔ تمھاری ساری عمر پڑی ہے۔ تمھارے انکل کی یہی تمھیں advice ہے۔"

یہ کہہ کر میں بغیر پیچھے دیکھے دوسری جانب روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد پہلے نلکے سے وضو کیا۔ غلط سلط نماز پڑھی۔ سجدہ سہو کیا اور معاملے کو یوں ختم سمجھا کہ یہ ضرور غلط فہمی تھی میری یا اس کی، یا دونوں کی۔

اس حسن کو کیا کہیے

مشہور شاعر Keats نے لکھا:

Beauty is truth, truth beauty.

اور یہ بھی کہا:

A thing of beauty is a joy for ever.

اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں تو یہ بات سو فی صد سچ ہے۔

حسن اللہ کی دین ہے، مصور تو وہی ہے نا۔

کئی صوفیوں کی مثالیں ہیں کہ وہ عشق مجازی کا سفر کرنے کے بعد ہی عشق حقیقی تک پہنچے۔ بابا بلھے شاہ فرماتے ہیں:

بلھیا رب نوں کینویں پونا
ایتھوں پٹناتے اوتھے لونا

حسن سے متاثر ہو کر ہی مجنون نے صحراؤں کا رخ کیا۔ یہ شیریں کا حسن ہی تھا کہ فرہاد نے تیشا اٹھا کر پہاڑ کاٹنا شروع کر دیا۔

حسن وہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ انسان کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر لے جاتا ہے۔

RekhtaDownload.com

یہ کہنا غلط ہوگا کہ حسن پرست صرف مجنوں یا فرہاد جیسے لوگ تھے۔ شریف سے شریف انسان بھی حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ حسن کا ہی کرشمہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر مصر کی شہزادیوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔

میرا ایک دوست ہے، بہت شریف انسان۔ پانچ وقت کا نمازی اور پکا فیملی مین۔

کچھ سال پہلے وہ بزنس کے سلسلے میں رومانیہ گیا۔ وہاں فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہرا جہاں صرف غیر ملکی مہمان ہی ٹھہر سکتے تھے۔

اس کی بزنس میٹنگز جلدی ختم ہو جاتیں اور اسے زیادہ وقت ہوٹل کی لابی وغیرہ میں گزارنا پڑتا۔

ریسٹورنٹ میں سامنے کی میز پر اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی تو وہ stunned ہو کر رہ گیا۔ وہ ساری دنیا گھوما تھا لیکن اتنی خوب صورت لڑکی کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی اس نے محسوس کیا جیسے قوس وقزح کے رنگوں کے اوپر وہ آسمان پر اڑ رہا ہے۔ شاید ایسے ہی لمحوں کے لیے فیض احمد فیض نے لکھا تھا:

تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

میرے دوست کا دل دھڑک رہا تھا۔ مجنوں سچا تھا کہ لیلیٰ کے لیے صحراؤں کا رخ کیا۔ فرہاد کی طرح تیشا اٹھا کر پتھر کاٹنے کا جواز بھی بالکل موزوں تھا۔ اسی حسن نے سکندر اعظم جیسے فاتح کے نامور استاد ارسطو کو گھوڑا بنا کر اس پر سواری کر کے سکندر کے سامنے بے آبرو کر دیا تھا۔ میرا دوست اس لڑکی کے حسن کو دیکھ کر ہی اتنا خوش ہو رہا تھا جیسے کوہِ نور مل گیا ہو۔

کھانا ختم ہوا تو اس خوب صورتی کے سحر سے سرشار وہ ریسٹورنٹ سے اپنے بیڈروم کے لیے اٹھا۔

چوتھے فلور پر جانے کے لیے جب لفٹ میں داخل ہوا تو وہ لڑکی بھی لفٹ میں پہنچ گئی۔ دروازہ بند ہوا تو وہ اکیلے لفٹ میں رہ گئے۔ میرے دوست کے منہ سے بے اختیار نکل گیا:

”ہیلو“

لڑکی بولی: ”رات کے لیے سو ڈالر۔“

میرے دوست پر جیسے برف پڑ گئی ہو۔ بولا:

”نہیں میں ویسا نہیں ہوں۔“

لڑکی نے اپنا ہاتھ پیار سے اس کے کاندھے پر پھیرتے ہوئے کہا:

”چلو پچاس ڈالر ہی سہی۔“

نہیں نہیں نہیں! میرا دوست سحر سے نکل کر کرب میں مبتلا ہو چکا تھا۔

دینا

کچھ لوگ نہیں بھلائے جا سکتے۔ وزیر، امیر، بیوروکریٹ فارغ ہونے کے بعد ہفتوں میں نہیں تو مہینوں میں ان کے نام بھی یاد نہیں رہتے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے عزیز جو اللہ کو پیارے ہو چکے ہوتے ہیں، وہ بھی کسی حد تک بھولتے تو نہیں لیکن زخموں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے وکھرے قسم کے لوگ بھی ہوتے ہیں جو زندگی بھر نہیں بھولتے۔ دینا بھی وکھرا charecter تھا کہ آج تک یاد ہے۔ یہ ہندوستان کے بٹوارے سے پہلے کا واقعہ ہے۔

نام اس کا شاید محمد دین تھا یا عالم دین۔ کچھ معلوم نہیں، اسے بہت کم لوگ جانتے تھے اور جو جانتے تھے وہ اسے دینا دینا ہی کے نام سے پکارتے تھے۔

ہم گورداسپور شہر میں رہتے تھے۔ میں ان دنوں گورنمنٹ ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ ہمارا مکان ہندوؤں کے محلے میں تھا۔ ساتھ والے گھر کے مالک کے نیچے کے حصے میں ایک دکان تھی جس میں نہ کوئی کھڑکی نہ روشن دان تھا۔ بس ایک پھٹا نما دروازہ تھا جو بند ہونے کے بعد کمرے کے اندر اندھیرا کر دیتا۔ نہ بجلی تھی نہ پانی، البتہ دکان بند کرنے کے بعد کنڈی اور تالہ لگایا جا سکتا تھا۔ دروازہ اندر سے بھی بند ہو سکتا تھا۔ ماہانہ کرایہ شاید آٹھ آنے ہوگا۔ ایک دو گھر چھوڑ کر ایک مسجد تھی جس میں داخل ہونے کے لیے کم از کم بیس سیڑھیاں چڑھنا پڑتیں۔ وہاں ہر وقت اندھیرا رہتا۔ نہ میں نے کبھی وہاں امام دیکھا اور نہ ہی نمازی۔ لوگ اسے جنوں والی مسجد کہتے اس

لیے ہم اس طرف جانے سے ڈرتے۔ البتہ پتنگیں لوٹنے کے وقت ہمیں جن یاد نہ رہتے اور ہم تیزی سے وہاں سے بھاگ کر گزر جاتے۔ ممکن ہے وہاں نمازیں ہوتی ہوں مگر جنوں کے ڈر سے وہاں نہ گھس پاتے۔

اس اچھے خاصے بڑے محلے میں ایک ہمارا گھر مسلمان تھا۔ ایک اکیلا دکان میں بند دینا اور ایک جنوں والی مسجد۔ ارد گرد باقی سب کٹر ہندو آباد تھے۔

دینے کی عمر 40 کے لگ بھگ ہو گی۔ سارا سارا دن وہ دکان میں بند رہتا۔ بالکل ایسے جیسے وہاں کوئی نہ ہو۔ کبھی کبھی کونڈی ڈنڈا چلنے کی آوازیں آتیں جیسے کوئی مسالہ پیس رہا ہو یا شاید بھنگ گھوٹ رہا ہو۔ شام کو پورے سات بجے دینے نے کچھ سامان اٹھانا اور شہر کے بازار کے اس کونے میں جا کر پڑاؤ ڈال لینا جہاں اس سے کوئی نہ جھگڑے۔ وہاں اس نے انگیٹھی جلانی، کوئلوں کو سرخ کر کے سیخ کباب لگانے شروع کر دینے۔ وہ اتنے تھوڑے اور اتنے مزے دار ہوتے تھے کہ دینا سات سے آٹھ بجے تک تمام کاروبار سے فارغ ہو جاتا۔ اسے زیادہ کمانے کی خواہش نہ ہوتی۔ ایسے لگتا جیسے اس نے اپنا بجٹ بنایا ہوا ہے کہ چھ آنے کمائے اور بس۔ اس کے لیے یہی کافی ہیں۔

اول تو اس کے کباب ساڑھے سات بجے تک بک جاتے ورنہ وہ آٹھ بجے سب کچھ لپیٹ لپاٹ کر اس اندھیری پناہ گاہ کی طرف لپکتا۔ ایسے لگتا جیسے جب اس کی اپنی ضروریات پوری ہو گئیں تو زیادہ پیسے کی وقعت نہ رہتی۔

یہ ان پرانے وقتوں کا ذکر ہے جب رات آٹھ بجے ہی سناٹا چھا جاتا۔ رات نو یا ساڑھے نو بجے تک سب سو چکے ہوتے۔ رات کے تین بجتے تو دینے کی دکان سے ہلکی ہلکی نہایت سریلی آواز میں کچھ اس انداز سے گانا شروع ہو جاتا جیسے سوز میں ڈوبی ہوئی آواز سات آسمانوں سے فریاد کر رہی ہے۔ گانے کو میوزک کا ردھم دینے کے لیے دینا انگلیوں سے کسی لکڑی کی چیز پر ساتھ ساتھ طبلہ بجاتا۔ یہ heavenly قسم کا گانا اور طبلہ ڈسٹرب کرنے کے بجائے ہمارے

لیے لوری کا کام کرتا۔ دینے کو اس حالت میں کسی نے کبھی نہیں دیکھا۔ دکان کی کنڈی اندر سے ہمیشہ بند ہوتی۔ عجیب اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس ہندوؤں سے بھرے محلے میں بھی کبھی اس کے گانے پر کبھی ہلکا سا بھی اعتراض نہیں کیا گیا۔ بلکہ لوگ اس کو کچھ حیرت اور کچھ عزت سے دیکھتے۔ جب اذان ہوتی تو اس کا گانا بھی بند ہو جاتا۔ اس کے گانے کے بول کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔ یہ روٹین ایسے بن گئی جیسے یہ اس communtiy کا ایک جز ہو۔ اور یونہی تین چار سال گزر گئے۔ میں بھی عمر میں کچھ بڑا ہو گیا تھا لیکن کبھی کبھی دینے کے پاس کباب کھانے کی عادت نہ گئی۔

دینا ہمیشہ order لیتا اور خاموشی سے کبابوں کی پلیٹ تھما کر پیسے وصول کر لیتا۔ اس کے علاوہ میں نے کبھی اس سے ادھر ادھر کی بات نہیں سنی۔

ایک شام اس کے دو گاہک بیٹھے اس سے تقاضا کر رہے تھے۔ ''یار دینے یہ بتاؤ کہ رات کو تم کیا گاتے ہو؟ کس زبان میں گاتے ہو اور کس کے لیے گاتے ہو؟ اگر تمھیں عشق میں دھکا لگا ہے تو ہم تمہارے لیے کوئی منہ چت لگتی عورت ڈھونڈ دیتے ہیں۔ یار بتاؤ تو سہی۔'' پوچھنے والے دینے کے permanent گاہک تھے اور جب انھوں نے زچ کیا تو دینا پہلی دفعہ بولا، کہنے لگا:

''مجنوں کے زمانے میں لیلیٰ سے زیادہ خوب صورت عورتیں بھی موجود تھیں لیکن مجنوں کو کوئی نہ بھاتی۔ ایک مرتبہ لوگوں نے مجنوں سے کہا۔ ہم لیلیٰ سے حسین تیرے پاس لاتے ہیں۔ مجنوں نے جواب دیا میں لیلیٰ کو اس کی صورت کی وجہ سے دوست نہیں رکھتا۔ لیلیٰ صورت نہیں ہے۔ لیلیٰ میرے ہاتھ میں ایک جام ہے۔ میں اس جام سے شراب پیتا ہوں۔ تمھاری نظر پیالہ پر ہے۔ تم شراب سے آگاہ نہیں ہو۔ اگر سونے کے پیالے میں شراب کے بجائے سرکہ بھرا ہوا ہو تو وہ پیالہ میرے کس کام کا۔ میرے لیے پرانا اور ٹوٹا ہوا پیالہ ہی بہتر ہے جس میں شراب ہو۔ شراب اور پیالے کو علیحدہ علیحدہ پہچاننے کے لیے شوق، جستجو اور آشنائی کی ضرورت ہے۔''

دینے کی یہ بات ہم تینوں کے سروں کے اوپر سے گزر گئی اور اسی اثنا میں کباب جل گئے۔ اس واقعہ کے بعد میں امتحانوں میں مصروف رہا اور کچھ عرصہ گزر گیا۔ کچھ دنوں سے دینے کے گانے کی آواز نہ سنی۔ سوچا شاید بیمار ہو۔ صبح جب لوگوں سے پوچھا تو پتہ چلا دو دن پہلے دینا اپنی دکان میں مرا پایا گیا۔ اس کا کوئی دوست اور رشتہ دار تو تھا نہیں، کمیٹی والے لاش کو اٹھا کر لے گئے تھے۔

RekhtaDownload.com

شاہ صاحب

آج سے چودہ برس پہلے کا ذکر ہے۔ فیصل آباد posting کے دوران میں مجھے دفتروں میں مسجد کے معاملات نمٹانے کے لیے کبھی کبھی وقت نکالنا پڑتا۔ مسجد کے امام نابینا تھے اور مسجد کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے۔ جمعہ کی نماز اور رمضان میں نمازِ تراویح کے لیے ایک پڑھے لکھے عالم آجایا کرتے۔ ایک تیسری شخصیت تھی اور وہ تھے مسجد کے موذن۔ ہاتھ سے دھلے ہوئے صاف ستھرے کپڑے پہنتے۔ مسجد ہی میں رہتے اور کھانا نہ جانے کہاں سے کھاتے۔ مسجد کے فنڈز سے ان کو تیس چالیس روپے ماہوار ان کے ذاتی اخراجات کے لیے دیئے جاتے۔ سفید داڑھی، نورانی چہرہ اور خوب صورت نقش۔ جوانی میں اچھے خاصے جاذب قسم کے نوجوان ہوتے ہوں گے۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے تھے۔ انگریزی بھی سمجھ اور بول لیتے۔ اکثر مسجد کے کسی کونے میں بیٹھے کسی انجانی دنیا میں کھوئے رہتے۔ اردگرد کے ماحول سے ناآشنا۔ میں نے ان کا اصلی نام کبھی نہیں پوچھا۔ سب لوگ ان کو شاہ صاحب کے نام سے پکارتے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا میرا تجسس بڑھتا گیا کہ یہ نہ تو روایتی مولوی ہیں اور نہ ہی درس دیتے ہیں لیکن یہ مسجد میں ان کا دائمی قیام کیسے ہے؟ ایک پڑھے لکھے آدمی کا اذان دے کر بیٹھ رہنا سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بہرحال مجھے وہ اچھے لگتے تھے اور رفتہ رفتہ میری ان کے ساتھ کچھ کچھ بے تکلفی ہوگئی۔

ایک روز بڑی سردی تھی اور چھٹی کا دن تھا۔ اتفاق سے میرا مسجد کے پاس سے

RekhtaDownload.com

گزر ہوا تو دیکھا کہ شاہ صاحب اکیلے مسجد کے صحن میں دھوپ سینک رہے ہیں۔ میں نے سوچا آج شاہ صاحب سے باتیں کرنے کا موقع ہے۔ کبھی کبھی انسان احساسات اور جذبات سے مغلوب ہو کر چھلک پڑتا ہے۔ میری خوش قسمتی کہ شاہ صاحب بھی اس وقت اسی کیفیت میں تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد انھوں نے وہ راز اُگل دیا جس نے مجھے تجسس میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ان کی داستان ان کی اپنی زبان سے سنئے، کہنے لگے:

''میں ریلوے میں ایک کلرک ہوا کرتا تھا۔ ورثے میں ایک گھر اور تھوڑی سی زمین بھی ملی تھی۔ میری شادی ہوئی۔ دو بچے ہوئے، پانچ سال بعد ایک بچہ فوت ہو گیا۔ ایک سال نہیں ہوا تھا کہ میری بیوی بیمار ہوئی اور وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ابھی میں جوان تھا۔ کچھ عرصہ بعد میں نے دوسری شادی کر لی۔ سات آٹھ سال کے اندر جو بچے ہوئے وہ بھی مر گئے۔ ایک لڑکا اور میری بیوی رہ گئے۔ پھر میری دوسری بیوی بھی موت کی آغوش میں چلی گئی۔ میں تن تنہا ایک دل ٹوٹا ہوا انسان اداسیوں میں کھو کر رہ گیا۔

خودکشی کرنے کا سوچتا مگر حرام سمجھتے ہوئے زندگی ختم نہ کی۔ بڑے دکھ کے دن تھے۔ بڑے دکھ کے دن تھے۔

رمضان کا مہینا آیا۔ ہر سال کی طرح روزے رکھے اور اختتام پر عید پڑھنے گیا۔ نماز کے بعد لوگ گلے مل رہے تھے اور جلدی جلدی اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ میں بھی چل پڑا۔ میرا دماغ پھٹنے لگا۔ میں کس گھر جاؤں؟ میرا کون سا گھر ہے؟ میری فیملی کدھر ہے؟ سوچتا جا رہا تھا اور روئے جا رہا تھا۔ گھر جانے کے بجائے میں اپنے دفتر پہنچا۔ کمرے کا دروازہ کھولا اور رونا، دھاڑوں اور چیخوں میں بدل گیا۔ اتنا رویا کہ نڈھال ہو کر بنچ پر گر گیا۔ بے ہوش ہو گیا یا مجھے نیند آ گئی۔

کیا دیکھتا ہوں میری دونوں بیویاں اور تینوں بچے میرے پاس کھڑے ہیں۔ بالکل ایسے جیسے Living حقیقت ہو۔ بیویاں کہنے لگیں: ''شاہ صاحب آپ افسردہ کیوں ہیں؟

یہ دنیا تو مسافر خانہ اور ایک ساعت کا کھیل ہے۔ کوئی ٹرین پر پہلے سوار ہو جاتا ہے اور کوئی بعد میں۔ آپ دکھی ہو کر ہمیں افسردہ نہ کیا کریں۔ خوش رہا کریں۔ ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ پھر وہ غائب ہو گئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں سویا ہوا تھا یا جاگ رہا تھا مگر اس ملاقات اور گفتگو میں مجھے بالکل کوئی شک نہیں تھا۔ میں اٹھا۔ پانی پیا، زندگی میں پہلی بار ایک عجیب قسم کا سکون محسوس کر رہا تھا۔ جیسے مجھے وہ سمت مل گئی ہو، جس کی مجھے تلاش تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے نوکری سے استعفیٰ لکھا۔ میز پر چھوڑ کر گھر گیا۔ اپنے لڑکے کو ساتھ لیا اور اپنے بھائی کے گھر جا کر بچے کو اس کے سپرد کر کے اپنا گھر بھی اس کے حوالے کیا۔ اس کے بعد میں اس مسجد میں آ بیٹھا۔ یہاں مجھے دس سال ہو گئے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے''۔

یہ تھی شاہ صاحب کی کہانی۔ اس ملاقات کو ایک سال نہیں گزرا ہو گا کہ شاہ صاحب بیمار ہو گئے۔ جب کبھی ان کی بیمار پرسی کا اتفاق ہوتا تو وہ صرف یہ کہتے: ''اللہ کا بڑا شکر ہے، اللہ کا بڑا احسان ہے۔'' اور پھر ایک دن وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

RekhtaDownload.com

دو رومانس

دو قصے بتاتا ہوں۔ پڑھنے کے بعد فیصلہ آپ کریں کہ یہ حقیقت سے ہٹ کر ہیں یا ایسا عام طور پر ہوتا ہے۔

پہلا قصہ

پچھلی صدی میں Somerset Maugham ایک مشہور English auther ہوا ہے۔ اس کے ناول اور شارٹ کہانیاں بہت مقبول ہوئیں۔ اس نے اپنی زندگی کی اپنی کہانی مشہور ناول "Of Human Bondage" میں لکھی۔ اس ناول کو بہت پسند کیا گیا۔ جب وہ میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا تو وہاں کیفیٹریا میں کام کرنے والی لڑکی سے عشق ہو گیا۔ گھنٹوں وہاں جا کر بیٹھا رہتا تا کہ اس کا قرب حاصل کر سکے۔ کم از کم اس کو دیکھتا رہے۔ بڑے جتن کیے مگر وہ لفٹ نہ کراتی۔ جب اس waitress کو اس کے عشق کا پتا چلا تو اس کا نخرہ اور بڑھ گیا۔ ادھر اس کی نیندیں حرام ہو رہی تھیں، ادھر اس کی بے اعتنائی بڑھ رہی تھی۔ بے چارے کا درد اس وقت حدیں پار کر گیا جب اسے معلوم ہوا کہ اس لڑکی کی ہر شام مختلف لوگوں سے گزر رہی تھی۔ کوئی student ہو یا سامان لانے والا ٹرک ڈرائیور۔ وہ ہر ایک کے لیے avaliable تھی۔ نخرہ صرف عشق میں مبتلا ہیرو سے تھا۔ جب تک وہ اس میڈیکل کالج سے ڈاکٹر نہ بن گیا وہ اسی کرب

اور اذیت میں رہا۔

ڈاکٹری پاس کرنے کے تین سال بعد ایک سرد شام وہ clinic سے اپنے فلیٹ لوٹ رہا تھا کہ ایک street girl یعنی prostitute فٹ پاتھ پر کھانستے کھانستے آدھ موئی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے بڑھ کر ہاتھ پکڑا تو اسے بخار بھی تھا۔ اتفاق دیکھیے یہ وہی کالج کے کیفٹیریا کی waitress تھی۔

ڈاکٹر اسے اپنے فلیٹ پر لے گیا۔ اسے دوائی دی، نہلوایا، پہننے کے لیے کپڑے دیے۔ اچھا کھانا کھلوایا، سونے کے لیے اپنا بیڈ دیا اور خود ساتھ والے کمرے میں صوفے پر رات گزاری۔

دو دن میں وہ لڑکی ٹھیک ہوگئی اور وہی پرانا نخرہ پھر لوٹ آیا۔ Moment of truth اس وقت پہنچا جب شام کو بالآخر کہنے لگی: آجاؤ جو کچھ بھی تم چاہتے تھے۔ جس لڑکی کے عشق میں چار اذیت ناک سال گزارے تھے۔ ڈاکٹر کو اس سے گھن آئی۔ اس نے فلیٹ کا دروازہ کھول کر کہا: ''اب تم جا سکتی ہو۔''

RekhtaDownload.com

دوسرا قصہ

1970ء میں امریکہ میں ایک فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ لکھا تھا کہ وہ سچی کہانی ہے۔

فلم یوں شروع ہوتی ہے۔ ایک پارک کے ساتھ عالی شان گھر ہے۔ پارٹی ختم ہو رہی ہے۔ شہر کی اعلیٰ اور معزز کلاس شرکت کر رہی ہے۔ پارٹی ایک نہایت امیر Duchess نے اپنے گھر میں دے رکھی ہے۔ hostess اٹھائیس تیس سال کی ہوگی۔ دل کش اور مہذب قسم کی خاتون جو اپر کلاس میں رکھ رکھاؤ کا بہت خیال رکھتی ہو۔ ادھر پارٹی ختم ہوتی ہے۔ ادھر زبردست بارش شروع ہو جاتی ہے۔ مہمان جا چکے ہوتے ہیں تو جب سونے کے لیے بیڈروم میں جاتی ہے تو بجلی چمکنے سے اسے پارک میں ایک bench پر کوئی شخص بارش اور سردی سے بچنے کے لیے کاغذ اوڑھ کر بچاؤ کرتا نظر آتا ہے۔ اس کو فقیر سمجھ کر انسانی ترس کھاتے ہوئے یہ اپنے ملازم کو بلا کر اسے اپنے گھر بلواتی ہے۔ آنے والا بھیگا شخص ایک نوجوان ہے۔ خوبرو اور بہت اچھی باڈی والا۔ لیکن چال ڈھال سے بالکل غریب اور کامن لگتا ہے۔ دونوں کی education اور تہذیب کا اتنا فرق ہے جیسے چیچوں کی ملیاں کے قصاب کا فرانس کی کسی شہزادی سے آمنا سامنا ہو جائے۔

اس نوجوان کا اتا پتا پوچھتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ گونگا ہے۔ بہرحال اسے گرم پانی سے نہلوا کر اچھے کپڑے دیے جاتے ہیں۔ کھانا کھلوا کر سونے کے لیے عمدہ بیڈروم دیا جاتا ہے۔ قصہ مختصر یہ duchess اس پر عاشق ہو جاتی ہے۔ اس کو مستقل طور پر اپنے گھر رکھتی

ہے۔ کار اور ڈرائیور اس کی ڈسپوزل پر اور ساتھ خوب پیسے بھی دیتی ہے۔

اب یوں ہوتا ہے کہ یہ جب بھی اس کی طرف بڑھتی ہے۔ گونگا نہایت معصومیت سے کھسک جاتا ہے۔ کئی بار جتن کرتی ہے پر وہ قابو میں نہیں آتا۔

ادھر یہ اسی کی کار، اسی کے دیے پیسوں سے تھرڈ کلاس کنجریوں کے پاس جا کر عشق کرتا ہے۔

آخر ڈچس کو پتا چل جاتا ہے۔ بے چاری کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ کیا میں ایک تھرڈ کلاس کنجری سے بھی گئی گزری ہوں؟ رنج کم کرنے کے لیے وہ لانگ ڈرائیو پر نکل جاتی ہے۔ بہت رات گئے جب گھر لوٹتی ہے تو گونگے کے کمرے سے ہنسنے اور باتوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ peep کر کے دیکھتی ہے تو وہ نوجوان جسے وہ گونگا سمجھتی تھی کسی کنجری سے باتیں کر کے زور زور سے ہنس رہا ہے۔ اس نے گونگا ہونے کا نہ صرف ڈھونگ رچایا تھا بلکہ کنجریوں کو duchess کے گھر بھی بلانا شروع کر دیا تھا۔

یہ سیدھی کچن میں جاتی ہے۔ بڑا چاقو لے کر ان کے کمرے میں جا کر چاقو کنجری کے پیٹ میں گھونپ دیتی ہے۔ وہ وہاں سے بھاگ نکلتا ہے۔ یہ پیچھے بھاگتی ہے اور کہتی ہے:

How could you do this to me?

RekhtaDownload.com

کھوجی

وہ پڑھا لکھا تھا مگر مذہب میں کورا تھا۔ وہ ہر چیز کو کریدتا، سوچتا اور اس کی تہ تک پہنچے بغیر اسے چین نہ آتا۔ کھوجی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ پیدائشی فلسفی بھی تھا۔

وہ سوچتا کہ زمین بنی، اس پر لائف آئی۔ انسان پیدا ہوتا ہے، پہلے بچہ ہوتا ہے، پھر جوانی کو پہنچتا ہے۔ شادی کرتا ہے۔ بچے ہوتے ہیں۔ اس کی باڈی ڈویلپ ہوتی ہے۔ اس کا مائنڈ ڈویلپ ہوتا ہے۔ خوشیاں مناتا ہے۔ مصیبتیں جھیلتا، struggle کرتے کرتے تھک کر بوڑھا، بیمار اور لاچار ہو کر آخر مر کر زمین میں کیڑے مکوڑوں کی خوراک بن جاتا ہے۔

اسی طرح اس کے بچے اپنی اپنی باری اسی process سے گزرتے گزرتے چھ فٹ نیچے زمین میں دفن ہو جاتے ہیں۔ پشت در پشت سے یہی ہو رہا ہے۔

ان لوگوں میں ایک اعلیٰ عمدہ کلاس بھی ہے۔ مثلاً نیوٹن، شیکسپیئر، گوئٹے اور کئی ان جیسے gifted اور ذہین لوگ۔ ان کا انجام بھی یہی ہوا۔

زمین بنی، یہ نسلیں آئیں۔ طرح طرح کے لوگ آئے۔ اپنا اپنا کردار کر کے development کی اور آخر ہر ایک کا حشر ایک ہی ہوا۔ کیا یہ سب کچھ senseless ہے؟ اس

میں ضرور کوئی راز ہے۔

ایک روز کھوجی نے سقراط کی موت سے متعلق پڑھا۔ سقراط کو زہر کا پیالہ دیا گیا۔ وہ اطمینان سے زہر پیتا گیا اور ساتھ ساتھ حاضرین کو بتاتا گیا کہ زہر کیسے اثر کرتا ہے۔ بتایا کہ پہلے اس کے پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں اور یہ numbness آہستہ آہستہ اوپر دل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کو معلوم تھا کہ میں مر رہا ہوں لیکن سارا حال بتاتے ہوئے سقراط ایسے جان دے دیتا ہے جیسے یہ ایک معمولی تجربہ ہو۔

مرتے وقت سقراط کو یہ سکون، یہ اطمینان کس چیز نے دیا۔ اس کے پاس ضرور کوئی علم ہوگا جس پر اس کو پختہ یقین تھا۔ علم تو کبھی نہیں مرتا۔ کھوجی اس علم کی تلاش میں نکل پڑا۔ وہ زمانہ حال کے سقراط کو ڈھونڈنا چاہتا تھا۔

وہ ایک سیانے کے پاس جاتا، گفتگو کرتا۔ پھر دوسرے سیانے سے دانائی حاصل کرتا لیکن اس کی تڑپ بڑھتی گئی۔ آخر کسی نے کہا کہ فلاں پہاڑ کے پار ایک بوڑھا درویش رہتا ہے۔ شاید وہ تمھاری مدد کر سکے۔

کھوجی طویل مسافت کے بعد اس ٹھکانے پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک ضعیف بڈھا بیٹھا ہے۔ اردگرد لوگ ادب سے بیٹھے ہیں۔ بوڑھے کی جب مرضی ہوتی تو کچھ بات کر دیتا جس کو کوئی نہ سمجھتا کوئی نہ سمجھتا۔ کھوجی نے ہر روز وہاں جانا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ اس پر یہ بات کھلی کہ بوڑھا ہر ایک کے راز سے واقف ہے جیسے

He could see through every body.

جب بھی کھوجی کے دل میں کچھ سولات ابھرتے تو درویش ان کا جواب دے دیتا حالانکہ اس کو زبان سے کچھ نہیں بتایا گیا ہوتا۔ جو بھی لوگ اس درویش کے پاس آتے ان سب کا یہی experience تھا۔

دوسری بات مزید حیران کن تھی۔ ہر ملاقات میں اس کو اس مرد خدا میں ایک نئی

شخصیت کا احساس ہوتا۔

آخر ایک دن کھوجی نے ہمت کر کے پوچھ ڈالا:

''جناب! آپ آخر ہیں کون؟''

بوڑھے کو غصہ آیا۔ کہنے لگا:

''یہ 'کون' کیا ہوتا ہے؟ جاؤ بھاگو یہاں سے۔''

''تمھیں کون کا بھی نہیں پتا۔''

کھوجی گھبرا گیا کہنے لگا:

''میرا مطلب ہے جب آپ پیدا ہوئے تھے تبھی سے gifted ہیں؟''

بوڑھا بولا: ''تمھارا مطلب ہے جب میں پیدا ہوا تھا۔''

''جی جی جی۔'' کھوجی کی جان میں جان آئی۔

درویش چلایا:

''بیوقوف انسان یہ 'میں' کب پیدا ہوا تھا۔ میرا تو صرف جسم پیدا ہوا تھا۔ کیا تمھیں اتنا بھی نہیں معلوم؟ یہ جھگڑا ہی 'میں' کو سمجھنے کا ہے۔ 'میں' کو سمجھ لو تو سقراط جیسا سکون اور اطمینان حاصل کر لو گے۔''

''پر جناب کیسے؟'' کھوجی گڑگڑایا۔

درویش کا غصہ ختم ہو چکا تھا۔ پیار سے سمجھانے لگا۔

''ارے، خدا جس نے زمین اور آسمان بنائے اس کو مان۔ اس کی کتاب قرآن پڑھ۔ بار بار پڑھ اور اسے سمجھ۔ یہ پریوں کی کہانیوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس کو اتارنے والے کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ منتیں کرو، گڑگڑاؤ، شاید کائنات اپنا راز اگل دے۔ تمھیں 'میں' کی اہمیت سمجھ آ جائے گی۔ زمین پر لائف کا یہی راز ہے۔''

بے چارا کھوجی ایک کھوج سے نکل کر سوچ کے بہت بڑے سمندر میں داخل ہو

RekhtaDownload.com

چکا تھا۔ 'کون' کیا ہے؟ 'میں' کون ہوں؟

RekhtaDownload.com

اتفاق

روزمرہ زندگی کو لیں۔ کسی کام کے لیے کوشش در کوشش کرتے ہیں، روتے ہیں، سر پیٹتے ہیں، پوری ٹل لگاتے ہیں مگر کام نہیں ہوتا۔ پورس کے ہاتھی الٹے بھاگ پڑتے ہیں۔ دوسری طرف راہ جاتے ایک چھوٹا سا، معصوم سا واقعہ زندگی بدل کر رکھ دیتا ہے۔

اتفاق جسے ہم coincidence کہتے ہیں، اس کو سب مانتے ہیں۔ ہر مذہب مانتا ہے۔ سائنس سے کوئی ٹکراؤ نہیں۔ امریکن ہو، انگریز ہو، روسی ہو، پاکستانی ہو، کسی کو اس سے انکار نہیں۔

فرض کریں آپ نے کوئی فیصلہ کرنا ہے جس کے دو امکانات alternatives ہیں۔ آپ ٹاس کر لیں یا کسی سے مشورہ کر کے ایک alternative کا choice کر لیتے ہیں۔ اب جناب اس فیصلہ کے بعد زندگی اور داستان شروع ہوتی ہے۔ ایک event آتا ہے، پھر دوسرا event آتا ہے۔ قطار لگ جاتی ہے۔ لائف کا تانا بانا کچھ اس طرح کا pattern اختیار کرتا ہے جیسے کائنات کی تمام قوتوں نے مل کر آپ کو باندھ کر اس ڈگر پر چلا دیا ہو جو فیصلے کے وقت آپ کو معمولی اور معصوم سا قدم لگتا تھا۔

ہر شخص کی زندگی میں بے شمار coincidences ہوں گے لیکن مجھے زندگی میں جب بھی کوئی انعام ملا ہے یا خاص importance یا acceleated promotion یا بہت اچھا

فارن ٹرپ ان تمام events میں میری اپنی کوشش کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ چند واقعات شاید دل چسپ لگیں (لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بڑے بڑے غم بھی unexpected ملے)۔

تعلیم سے فارغ ہوتے ہی ابھی پندرہ دن بھی نہ گزرے ہوں گے کہ مجھے P.W.D میں نوکری مل گئی اور High way ڈیپارٹمنٹ میں S.D.O لگ گیا۔ میری posting ڈیرہ غازی خان میں ہوئی۔ ان دنوں ملتان سے ڈیرہ غازی خان آٹھ گھنٹے کا سفر ہوتا۔ گرمیوں میں دریائے سندھ میں ferry چلتی اور سردیوں میں دریا کی گزرگاہ میں عارضی سڑکوں پر گھنٹوں میں چند میل سفر ہوتا۔ یوں کہہ لیں کہ میں main civilization سے کٹ گیا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد I.C.S کو C.S.P کا نام ملا لیکن دوسرے professions کے لیے معاملہ فیڈرل اور provinces میں بٹ گیا۔

چار پانچ سال بعد Indian service of Engineering کا متبادل پنجاب نے P.S.E.I اپنایا۔ وہی تنخواہ، وہی service conditions۔ اس سروس کی پوسٹیں بہت کم رکھیں۔ 1952ء میں شاید چار۔ 1954ء میں چھ یا سات۔

1954ء کے لیے میں نے compete کیا۔ ابھی ڈیرہ غازی خان میں چند ماہ ہی گزرے تھے کہ مجھے لاہور public service commission میں انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ 1947ء کے بعد انجینئرنگ کرنے کے بعد تمام افراد compete کر رہے تھے۔ بہت tough مقابلہ تھا اور مجھے سلیکشن کی کوئی امید نہیں تھی۔

انٹرویو سے تین دن پہلے لاہور پہنچا۔ لاہور اسٹیشن کے بالکل سامنے ایک بہت اچھا Bergenze hotel ہوا کرتا تھا، اس میں قیام کیا۔ ان دنوں ٹیکسیاں ہوتی نہیں تھیں لیکن تانگے بہت عمدہ اور اچھی سروس دیتے۔ تین دن خوب گھوما۔ مال روڈ کی سیر کی۔ تمام فلمیں دیکھ ڈالیں۔ ڈیرہ غازی خاں کی بوریت دور کرنے کے لیے ہر اچھے ریسٹورنٹ میں جا کر چائے پی۔

تین دن یونہی گزر گئے۔ اگلے دن انٹرویو تھا۔ رات کو ہوٹل پہنچا تو معلوم ہوا کہ

تمام کے تمام کپڑے جو لایا تھا وہ پہن کر میلے کر چکا ہوں۔ انٹرویو کے لیے تیاری بھی نہیں کی۔ ٹیبل پر سامنے شرما کی لکھی ہوئی موٹی موٹی کتابیں بکھری پڑی تھیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر کمرے میں لوٹا۔ پتلون کو تہہ کر کے سرہانے کے نیچے رکھا۔ شرٹ کو ہاتھ سے استری کیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

سونے سے پہلے پڑھنے کی عادت سے مجبور ہو کر میز پر ہاتھ مارا اور شرما کی ایک کتاب کو at random کھول کر پڑھنے لگا۔ پڑھنا کیا تھا ایک diagram سامنے آ گئی۔ دریا پر ہیڈ ورکس کا cross section دو صفحوں پر پھیلا ہوا دیکھ کر گھورنے لگا اور نیند آ گئی۔

صبح public service commission میں انٹرویو کے لیے گیا۔ کمیشن کے ممبران کے علاوہ ٹیکنیکل سوالات کے لیے محکمہ کے ایک انگریز چیف انجینئر مسٹر R.F.T Ferrent کو مدعو کیا گیا تھا۔ ہر قسم کے عام سوالات پوچھنے کے بعد آخری باری مسٹر Ferrent کی آئی۔ اس نے چھوٹتے ہی سوال کیا:

''دریا پر ہیڈ ورکس کے ڈیزائن میں کن کن چیزوں کا خیال رکھو گے؟''

میرے دماغ میں فوراً پچھلی رات والی diagram آ گئی۔ میں نے کہا: ''کیا بلیک بورڈ استعمال کر سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں۔'' جواب ملا۔

میں وہی diagram بنا کر پورے confidence کے ساتھ explain کر ہی رہا تھا کہ مسٹر Ferrent بولے:

"Thank you, no more questions."

میں P.S.E.I میں select ہو چکا تھا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ محض اتفاق تھا کہ پچھلی رات تین کتابوں میں سے یونہی ایک اٹھا کر at random کھول کر جو میں نے دیکھا اور پڑھا، وہی سوال دوسرے دن مجھ

سے انٹرویو میں پوچھا گیا۔ کیا یہ اتفاق تھا جس نے میری تمام عمر کے carrear کو affect کیا۔ بلکہ ساری زندگی کو affect کیا۔

یہ sixties کا ذکر ہے۔ میں deputation پر محکمہ Anti corruption میں تھا۔ ڈیڑھ سال گزر چکا تھا اور میں اس جاب پر بہت دکھی تھا۔ خواہ مخواہ لوگوں کو پھنسانے کی طرف لگے رہنا۔ کوئی بے قصور پھنس جائے تو اس کی خلاصی بھی نہیں ہونے دینی۔

فلڈ کا season آ رہا تھا۔ چیف انجینئر فلڈ نے کہیں دریاؤں کے سروے پر میری رپورٹیں پڑھیں تو سیدھا میرے boss اور گورنمنٹ کو لکھ دیا کہ اس آفیسر کو اس کے ساتھ پوسٹ کر دیا جائے۔

مجھے اس سے متعلق کچھ بھی علم نہ تھا۔ جب یہ چٹھی میرے باس کے پاس پہنچی تو وہ لال پیلا ہو گیا۔ مجھے بلوا بھیجا۔ پولیس والے اکثر شکی ہوتے ہیں لیکن وہ بہت زیادہ شاکی تھا۔ مجھے سامنے بٹھا کر وہ چٹھی میری طرف سرکاتے ہوئے کہا کہ اس کو پڑھیں۔

میں نے پڑھ کر کہا: ''جی۔''

اب وہ بولا:

''کیا یہ چٹھی آپ نے لکھوائی ہے؟''

میں نے عرض کیا:

''جی نہیں۔''

ان دنوں نواب کالا باغ گورنر تھے اور میرے boss اس کے سب سے چہیتے آفسر تھے۔ سارے ویسٹ پاکستان کی administration کو میرے باس کے through نکیل ڈالی ہوئی تھی۔

مجھے غرا کر کہنے لگا:

''تمھیں یہاں سے کوئی مائی کا لال تبدیل نہیں کروا سکتا۔ جب میں یہاں

سے جاؤں گا اس وقت تک تمھیں میرے ساتھ ہی کام کرنا ہوگا۔''

اس واقعہ کے بعد میں مزید دکھی اور غم زدہ رہنے لگا۔

دو ہفتے کے بعد امریکن سنٹر سے امریکہ میں post graduate studies کے لیے ایک سکالرشپ نکلا۔ اخباروں میں اس کا اشتہار چھپا اور ساتھ foot note میں لکھا تھا کہ یہ وظیفہ teaching faculty کے لیے مخصوص ہے۔

مجھے اچانک سوجھی کہ کیوں نہ میں اس کے لیے apply کرنے کے لیے باس سے اجازت کے لیے request کروں اور دیکھوں کہ یہ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے اجازت بھی دیتا ہے یا میرا بیڑا غرق کرنے پر تلا ہوا ہے۔

میں نے فائل بنائی اور case بھیج دیا۔ دس منٹ کے بعد اس کا خاص چپڑاسی case واپس لے آیا۔ اس نے لکھا تھا:

"Yes! why not."

میری جان میں جان آئی۔ لیکن یہ سکالرشپ تو teaching faculty کے لیے تھا۔ بہرحال میں نے اس کے لیے apply کر دیا اور بھول گیا کیونکہ میرا مقصد اپنے boss کی نیت کو test کرنا تھا۔

تین ہفتے کے بعد مجھے انٹرویو کے لیے کال آ گئی۔ U.S.I.S. کی بلڈنگ جو G.P.O کے سامنے والی سڑک کے ساتھ ہوا کرتی تھی وہاں مجھے ڈھائی بجے بعد دوپہر پہنچنا تھا۔ اس دن میں نے دفتر سے چھٹی لے لی۔ میری بیوی سیالکوٹ گئی ہوئی تھی۔ میں گھر میں اکیلا ہی تھا۔ صبح گیارہ بجے مجھے دفتر سے پیغام ملا کہ فوراً پہنچوں۔

دفتر گیا تو میرے اسسٹنٹ نے کہا کہ U.S.I.S سے دو ٹیلی فون آ چکے ہیں۔ پندرہ منٹ تک وہ پھر بات کریں گے۔ پانچ منٹ بعد ٹیلی فون آ گیا۔ وہاں سے ان کا co-ordinator بول رہا تھا۔ کہنے لگا:

''جناب ہم سے غلطی ہوگئی ہے۔ ہم نے بھول کر آپ کو سکالرشپ کے لیے کال بھیج دی ہے۔ یہ facility تو صرف teaching faculty کے لیے ہے۔ آپ آنے کی زحمت نہ کریں۔''

''آپ نے بلایا کیوں؟'' میں تکرار کرنے لگا۔

وہ شریف آدمی تھا۔ کہنے لگا: ''آپ جو کہنا چاہتے ہیں، یہاں آکر انٹرویو کرنے والے بورڈ سے کہیں۔''

ابھی میں ٹیلی فون سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ میرا ایک senior دوست جو ان دنوں ریسرچ کا Director تھا، مجھے ملنے کے لیے آگیا۔ کہنے لگا کہ ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا تم سے ملتا چلوں۔

میں نے چائے منگوائی۔ وہ finance department کو کوس رہا تھا کہ research کیلیے funds بہت کم دیتے ہیں۔

مجھے اس کے فنڈز سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ میں نے یونہی کہہ دیا: ''آپ چھوٹے چھوٹے ماڈل بناتے ہیں۔ زیادہ فنڈز آپ کو کیا کرنے ہیں؟''

وہ بول پڑا جیسے اس کو چابی لگ گئی ہو۔

''ویسٹ پاکستان اتنا رقبہ ہے، اتنا صحرا، اتنا canal irrigated، اتنے ہیڈ ورکس ہین، ان میں سے اتنے problem میں آچکے ہیں۔ اتنے رقبے میں drainage problem ہے، اتنے رقبے تک پورا پانی نہیں پہنچ رہا، نہروں کی اتنی لمبائی ہے، اس میں اتنی length میں silt کی problem ہے۔''

یہ تمام facts اس نے شاید finance department میں اپنا case مضبوط بنانے کے لیے رٹے ہوئے تھے اور یہ سارا قصہ مجھے سنا کر اپنے دل کا بوجھ کم کر رہا تھا۔

میں نے اپنی مصروفیت کا بتا کر اس کو رخصت کیا اور واپس گھر آ گیا۔ انٹرویو میں

RekhtaDownload.com

دو گھنٹے باقی تھے۔

جلدی جلدی شیو بنائی اور نہانے کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔ شاور کے نیچے مجھے اپنی بے بسی پر اتنا دکھ ہوا کہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ گھر میں اکیلا تھا۔ اونچی اونچی آواز میں اللہ سے دعا کرنے لگا۔ یا اللہ اس نحوست کی جاب سے چھٹکارا دلا۔ جب دماغ ہلکا ہو گیا تو سوٹ پہن کر انٹرویو کے لیے نکل پڑا۔

وہاں waiting room میں پروفیسر لوگ انٹرویو کے لیے آئے بیٹھے تھے۔ ان میں سے کچھ میرے اپنے استاد رہ چکے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے کھلی ماری۔

''ارے تم یہاں کہاں؟''

اتنی دیر میں co-ordinator میرے پاس آیا اور کہنے لگا:

''چلیے۔ اندر interview board کے سامنے۔''

پروفیسروں نے پھر کھلی ماری۔ co-ordinator بھی طنزاً مسکرا رہا تھا۔

میں اندر گیا تو آٹھ ممبروں پر مشتمل بورڈ بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ پانچ یا چھ امریکن تھے اور دو تین پاکستانی۔

چھوٹتے ہی مجھے کہنے لگے:

''آپ کو معلوم نہیں یہ سکالرشپ صرف teaching faculty کے لیے ہے۔''

میں باہر پروفیسر کے مذاق سے اتنا جلا بھنا تھا، جیسے دماغ میں جن گھس آیا ہو۔

میں نے جواب دیا:

''آپ ان پروفیسروں کو امریکہ بھیجیں گے؟ یہ پہلے ہی باہر کے ملکوں سے پڑھ کر آئے ہیں۔ وہاں جا کر وہاں کی porblems اور وہی کتابیں پڑھ کر آ جائیں گے۔ ان کو پاکستان کی problems کا کیا پتا۔ ان کو کیا معلوم کتنے ہیڈ ورکس میں کیا کیا مشکلات ہیں؟ کتنی

silt جمی ہوئی ہے۔ drainage problem کیا ستیاناس کر رہی ہے۔ out lets کا کیا حال ہے؟ نہروں کی tails پر پانی کیوں کم پہنچ رہا ہے؟

ڈائریکٹر ریسرچ کے دو گھنٹے پہلے بتائے ہوئے facts کو روانی سے repeat کر کے انٹرویو میں اپنی کامیابی کی بجائے میں پروفیسروں کو مجھے مذاق کرنے کا غصہ نکال کر ایک طرح کا ان سے بدلہ لے رہا تھا۔

یہ سب کچھ کہہ کر میں نے کہا:

"ذرا ان پروفیسروں کو پاکستان کے نہری نظام کی problems تو پوچھ کر دیکھیں۔ پھر بڑے شوق سے انھیں امریکہ بھیجیں۔ ذرا یہ خیال کر لیں کہ اگر ان کو یہاں کا کچھ بھی پتا نہیں تو یہ وہاں کس نقطۂ نظر سے اپنا knowledge بڑھائیں گے۔"

بورڈ کے سارے ممبر خاموش مجھے سنتے رہے اور بٹر بٹر دیکھتے رہے۔

جب میرا حلق خشک ہو گیا تو کہنے لگا:

"Thank you very much."

باہر نکلتے وقت استادوں نے پھر کھلی ماری مگر میں select ہو چکا تھا۔

اس واقعہ کی کڑیاں ملائیں تو صاف ظاہر ہے کہ coincidences نے مجھے دھکیل کر anti corruption کے محکمے سے نکال کر امریکہ بھیج دیا۔

coincidence میں دل کو بہت سکون ملتا ہے۔ اس بہت بڑی cosmos (کائنات) میں زمین ایسے ہے جیسے صحرا میں ریت کا ایک ذرہ۔ انسان کی تو کچھ حقیقت ہی نہیں۔

خوشی اس بات کی ہے کہ اتنی بڑی کائنات ایک نہایت چھوٹے سے انسان سے غافل نہیں ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں concidences کی قطار لگی ہوئی ہے۔

اِنَّ ربی لطیفٌ لِمایشآءُ. اِنَّهٗ هُوَ العلیمُ الحکیمُ.

(بلاشبہ میرا رب جو چاہتا ہے اس کی تدبیر لطیف کر دیتا ہے، بلاشبہ وہ بڑا علم والا

اور حکمت والا ہے)

RekhtaDownload.com

ہر آن، نئی شان

ٹی وی پر ڈاکٹر اسرار گفتگو فرما رہے تھے۔ کسی بات پر ایک لاکھ سے زائد پیغمبروں کا ذکر آیا تو انھوں نے فرمایا کہ شاید مہاتما بدھ بھی پیغمبر تھے۔

میں مہاتما بدھ کی ہسٹری اور تعلیمات پڑھ چکا ہوں بلکہ Zen Budhism بھی پڑھا ہے۔

میں نے سوچنا شروع کیا کہ ڈاکٹر اسرار یہ کیا فرما گئے ہیں۔

آپ sufism پڑھیں اور مہاتما بدھ کی تعلیمات پڑھیں تو بہت سی باتیں کامن پائیں گے۔ فرق اتنا ہے کہ صوفی، خدا، خدا کے رسول اور شریعت کو اوّل سمجھتے ہیں۔ بدھ اس ضمن میں خاموش ہیں یا یوں کہہ لیں کہ انھوں نے do's اور donts پر زور دیا ہے۔

enlightenment کے بعد مہاتما بدھ نے دو باتیں بہت emphasis کے ساتھ کہیں۔

پہلی یہ کہ جب بھی انسان اپنا پہلا قدم اپنی دنیوی خواہشوں، آرزوؤں اور خوشیوں کو حاصل کرنے کے لیے رکھتا ہے تو اس کی suffering شروع ہو جاتی ہے۔

یہ بڑی حد تک حقیقت ہے۔ اس کو عقل کی یا ایک فلسفے کی بات کہہ لیں۔ اس میں divine کوئی چیز نہیں۔

دوسری بات مہاتما بدھ نے یہ کہی کہ دنیا میں ہر چیز ہر لمحہ بدلتی ہے۔

every thing changes۔

کوئی پیدا ہو رہا ہے، کوئی مر رہا ہے، کسی کے رزق میں کمی ہو رہی ہے، کسی کو بے حد و حساب دولت مل رہی ہے۔ کوئی بادشاہ پھانسی پا رہا ہے اور کوئی ماشکی تخت پر بٹھایا جا رہا ہے۔

دنیا میں کروڑوں انسان ہیں۔ ہر ایک کے الگ الگ سیاپے، الگ الگ خوشیاں۔ کسی کی خوشیاں کسی کی تکلیف ایک حالت پر نہیں رہتیں۔ ہر لمحہ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ ہر لمحہ سوچ تک بدلتی رہتی ہے۔ یہ انھوں نے سچ کہا۔

سورہ رحمٰن میں ہے:

''زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں، سب اپنی حاجتیں اسی سے مانگ رہے ہیں۔ ہر آن وہ نئی شان میں ہے۔''(۲۸)

بابا بلھے شاہ فرماتے ہیں:

سچیاں نوں پئے ملدے دھکے، جھوٹے کول بٹھائے
بھوریاں والے راجے کیتے، راجیاں بھیک منگائے
بلّھیا حکم حضوروں آیا، تس نوں کون ہٹائے
تاں میں بھیت سجن دے پائے

اے۔آر۔رحمان

اے۔آر۔رحمان انڈیا کا مانا ہوا ٹاپ میوزک کمپوزر ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہو گا کہ معجزے نہیں ہوتے، کرامات نہیں ہوتیں۔اسی کی اسٹوری لے لیں۔

عمر میں بڑا نہیں لگتا۔ اتنا شرمیلا ہے کہ ٹی وی پر انٹرویو میں اچھی طرح بات بھی نہیں کر سکتا۔

اس کی شہرت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ مشہور میگزین ''Times'' میں اس پر آرٹیکل لکھا گیا۔

وہ ایک کٹر ہندو گھرانے میں پیدا ہوا۔اس کا باپ کسی فلمی اسٹوڈیو میں میوزک ٹیم کا معمولی کارندہ تھا۔

اے آر رحمان ابھی چھوٹا ہی تھا کہ باپ انتقال کر گیا۔گھر میں فاقوں تک نوبت آ گئی۔

ایک رات شاید اس کی خواب میں غوث پاک عبدالقادر جیلانیؒ تشریف لائے تو اس نے ان سے دعا کے لیے کہا کہ اللہ میری فیملی کی مدد کرے۔

پھر کیا تھا۔غیب سے اس کو کام ملنے شروع ہو گئے۔اس کی دھنوں میں ایک ایسا میوزک بنتا جیسے جادو ہو۔

اس کا نام دلیپ کمار تھا۔ فیملی کٹر ہندو تھی۔ اس معجزے سے اتنا اثر ہوا کہ سارے کا سارا خاندان ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی مسلمان ہو گیا۔ اس نے اپنا نام اللہ رکھا رحمان رکھ لیا۔ اب اے آر رحمان کے نام سے جانا جاتا ہے۔

کسی نے اس سے پوچھا کہ یہ جادو جیسی دھنیں کیسے کمپوز کر لیتے ہو؟ کہنے لگا:

''میری مدد خدا کرتا ہے۔ میں نیچے کھڑا ہوتا ہوں لیکن میوزک کے وقت دیکھتا اوپر ہوں۔''

اے آر رحمان کا آج ایک فلم میں میوزک کے لیے معاوضہ دو کروڑ روپے سے اوپر ہے اور فلم ڈائریکٹروں کی قطار لگی رہتی ہے۔

اسے ہائی پروفائل زندگی اچھی نہیں لگتی۔ publicity کو بھی پسند نہیں کرتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب وہ میوزک play کرتا ہے تو لوگ خود بخود یقین کرنے لگ جاتے ہیں کہ اس کی دھنوں میں خدا کی مدد ہے۔

RekhtaDownload.com

پانچ ڈالر میں ایک مہینا

وہ امریکن تھا۔ نام اس کا Lass تھا۔ عمر چالیس سے ذرا اوپر ہو گی۔ Nuclear Physics میں کافی حد تک پڑھا ہوا، درمیانہ قد اور سنہری عینک پہنتا۔ ایک ٹانگ بالکل مفلوج ہو چکی تھی اس لیے چلنے میں کافی مشکل آتی۔ ٹانگ گھسیٹ گھسیٹ کر چلتا۔ بہت پہلے اس نے ایک انگریز لڑکی سے شادی کی تھی لیکن وہ نبھ نہ سکی۔ اس کی بیوی کسی حبشی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

یہ 66-1965ء کا ذکر ہے۔ میں ان دنوں کیلیفورنیا میں Post Graduation کے لیے ڈیوس یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ ہوسٹل میں امریکن کھانا پسند نہ تھا اس لیے کیمسٹری کے ایک اسسٹنٹ پروفیسر Crawford کے گھر ایک کمرہ مع باتھ روم ملنے پر بہت خوش تھا۔ وہاں میں اپنی مرضی کا کھانا پکا سکتا تھا۔ Crawford کی بیوی طلاق لے چکی تھی اور وہاں کے قانون کے مطابق اس کی تنخواہ کا بیشتر حصہ طلاق شدہ بیوی اور اس کے بچوں کی نذر ہو جاتا۔ اپنی آمدن بڑھانے کے لیے اس نے اپنے دو کمرے کرایہ پر چڑھا رکھے تھے۔ ایک میں میں رہتا اور دوسرے میں Lass۔ ڈرائینگ روم، ڈائننگ ٹیبل اور کچن استعمال کرنے کی پوری آزادی تھی۔ Crawford کا ایک چھوٹا ٹیڈی کتا تھا جو کمبخت ٹیبل پر چڑھ کر اس کی پلیٹ میں منہ ڈال کر اس کے ساتھ کھانا کھاتا اور ساتھ ساتھ اس کا منہ چاٹتا۔ مجال ہے گھر سے باہر نکلے، رات کو

بھی Crawford کے بیڈروم میں رہتا۔ شاید ساتھ سوتا ہو۔

ہم تینوں اس گھر میں چھڑے تھے۔ کبھی کبھی Crawford کی گرل فرینڈ آ جاتی جو خود طلاق شدہ تھی۔ اس نے دو بلیاں پال رکھی تھیں۔ وہاں دو دن کا Week end جمعہ کی شام سے شروع ہوتا۔ Crawford اور اس کی فرینڈ کھانے پینے کا سامان، کیمپ Log wood وغیرہ لے کر دو دن کے لیے پہاڑوں پر یا جھیل کے کنارے Holiday کے لیے چلے جاتے۔ کار کے پیچھے Sale boat لے جاتے۔ میں اور Lass لمبے Week end پر اکیلے ہوتے۔ کتا بھی ساتھ جاتا اور بلیاں بھی ساتھ۔

مہینے میں دو چار روز کے لیے Crawford کی گرل فرینڈ ماں باپ کو ملنے یا پتا نہیں کہاں، شہر کے باہر جاتی اور جاتے وقت دونوں بلیاں Crawford کے سپرد کر جاتی۔ جب محبوبہ کی بلیاں آ جاتیں تو Crawford ان کو اپنے ساتھ رکھ کر کتے کو کمرے کے باہر دھکیل دیتا۔ کتے کو یہ بات پسند نہ آتی اور گھر میں اچھا خاصہ ہنگامہ ہو جاتا۔ بہر حال یہ تھا ہمارا ماحول اور رہنے سہنے کا طریقہ۔

Lass ہر مہینے پانچ ڈالر ادھار لیتا۔ کبھی مجھ سے کبھی Crawford سے۔ اس کی اپنی کوئی گاڑی نہیں تھی اور نہ ہی وہ ڈرائیو کر سکتا تھا۔ وہ میرے یا Crawford کے ساتھ اسٹور پر جاتا اور مہینے بھر کا راشن خرید لیتا۔ جو وہ خریدتا اس کی لسٹ کچھ یوں ہوتی۔

آلو	ایک ڈالر
Beans کا بڑا ڈبہ	ایک ڈالر
تمباکو	40 سینٹ
سگریٹ رول کرنے کے کاغذ	20 سینٹ
کافی کے Beans	ایک ڈالر
دو ڈبل روٹی	50 سینٹ

ایک یا دو درجن انڈے　　　　ایک ڈالر اور کچھ سینٹ

ان دنوں یہ سارا Raw سامان پانچ ڈالر میں آ جاتا تھا۔ Margrin، شوگر، نمک وغیرہ Dining Table پر وافر ہوتے اس لیے ان کی خرید کی ضرورت نہ ہوتی۔ یہ تھا Lass کا مہینے میں ضروریات کا راشن۔

اب جناب Lass کیا کرتا۔ ڈبے سے کچھ Beans نکال کر ابال لیے۔ تھوڑی سی کافی بنالی اور ناشتہ کرلیا۔ دوپہر کو ڈبل روٹی کا Peace لیا۔ انڈا ابالا۔ سینڈوچ بنایا اور کافی کے ساتھ لنچ بنالیا۔ جس دن طبیعت نا چاہی تو صبح والے Beans اور کافی پر گزارہ کرلیا۔ رات کے کھانے پر وہ Beans کے ساتھ آلو اور سبزی ابال لیتا۔ Back yard میں کچھ سبزیاں اگائیں ہوئی تھیں ان میں گاجر اور Salad وغیرہ لے کر پلیٹ سجاتا اور بیئر کے ساتھ چسکے لے کر کھاتا۔ وہ بیئر بھی پیتا تھا اور یہ مفت کی بیئر اسے یوں ملتی کہ کیلیفورنیا میں قانون اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ گھریلو ضرورت کے لیے گھر میں کوئی بھی بیئر بنالے۔ Crawford نے پچاس ساٹھ خالی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ کیمسٹری کا پروفیسر تو وہ تھا ہی۔ ہر مہینے وہ یہ بوتلیں بیئر بنانے کے لیے بھر دیتا۔ Lass ان بوتلوں کو خوب دھوتا، صاف کرتا اور اس کے عوض اسے اجازت تھی کہ جب چاہے جتنی چاہے بیئر پیئے۔

نوکری تو وہ کرتا نہیں تھا۔ اب اس کا day to day شغل ملاحظہ ہو۔ اپنے بکسے سے موٹے کاغذ کا ایک رول نکالتا اور اس کو کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بچھا دیتا۔ سب کپڑے اتار کر صرف نیکر پہن کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا اور اس کاغذ پر ایک end سے لمبی لمبی calculations کیئے جاتا اور ساتھ ساتھ فارمولے لکھتا۔ اتنا higher mathematics میری سمجھ سے باہر تھا۔ وہ صرف اتنا کہتا کہ یہ computer designing کے کام آتا ہے۔ شام کو کاغذی رول کر کے پھر بکسے میں بند کر دیتا۔ دوسرے دن یہی کچھ پھر شروع ہو جاتا۔

ڈیڑھ دو مہینوں کے بعد calculations اور فارمولوں سے بھرے ہوئے تین چار رول لے کر Lass گم ہو جاتا۔ دس دن، پندرہ دن، بیس دن اس کی کوئی خبر نہ ہوتی۔ پھر کسی دن رات گئے گھر کے باہر بہت شور ہوتا۔ میوزک، نسوانی قہقہے، بہت لمبی Limoziene سے Lass صاحب نمودار ہوتے۔ پانچ دس Secromento کی کال گرلز اس سے چمٹی ہوتیں۔ سوٹ پہنا ہوا، گلے میں پھولوں کے ہار۔ جلوس کی صورت میں دروازے تک پہنچ کر وہ اس کو اس طرح الوداع کرتیں جیسے برسوں سے گوڑھی دوستی ہے۔ گھر میں اندر آتے ہی مجھ پر اور Crawford پر نہایت قیمتی تحفوں کی بارش ہو جاتی۔ اچھے چاکلیٹ، جرسیاں، قمیضیں، رسالے وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پانچ ڈالر کا ادھار لیا ہوا بھی واپس ہو جاتا۔ یہ سب کیسے ہوتا؟

اس کے calculations اور فارمولوں سے بھرے ہوئے وہ رول پانچ دس ہزار ڈالر میں بک جاتے۔ پتہ نہیں کہاں۔ Lass یہ ساری رقم لے کر سیدھا Call girls کے پاس جاتا۔ فائیو سٹار ہوٹل میں شان سے رہتا اور سب کچھ ان پر لٹا دیتا۔ شاید وہ ان سے اجتماعی عشق کرتا ہو۔ شاید وہ بھی کرتی تھیں۔ جب پیسے ختم ہو جاتے تو وہ ڈیوس کا رخ کرتا۔ سوائے ادھار کی رقم کے، سب کچھ لٹا دیا ہوتا۔

دوسرے دن صبح اٹھتا۔ breakfast کی ٹیبل پر وہی پرانا Lass، مجھ سے یا Crawford سے کہتا:

Can I borrow five dollers?

RekhtaDownload.com

قدرت اللہ شہاب کا ایک راز

ارشاد احمد حقانی صاحب اور احمد بشیر صاحب دونوں چوٹی کے بزرگ جرنلسٹ ہیں۔ کچھ موضوعات پر دونوں میں ٹک مٹک لگی رہتی نہے۔ حقانی صاحب نے بانگ دھل اس بات کا اقرار کیا کہ جو کچھ بھی ہے ایک بات اٹل ہے اور وہ یہ ہے کہ احمد بشیر جھوٹ نہیں بولتے۔ خواہ اس کی زد میں کوئی بھی آئے۔

شہاب صاحب پر مضمون لکھتے ہوئے احمد بشیر صاحب نے ان کا ایک ایسا واقعہ لکھا ہے جو سمجھ سے باہر ہے۔

1975ء میں شہاب صاحب وزارتِ تعلیم کے سیکرٹری تھے اور احمد بشیر ان کے ماتحت کام کرتے تھے۔ ایک روز صبح شہاب صاحب نے لڑکھڑاتی زبان میں ان کو حکم دیا کہ فوراً دفتر پہنچو۔ شیو نہیں کی تو کوئی پروا نہیں۔ ناشتہ نہیں کیا تو اس کا انتظام ہو جائے گا۔

احمد بشیر دفتر پہنچے تو شہاب صاحب کمرے میں اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔ پی اے کو حکم دیا کہ کوئی مداخلت نہ ہو۔ زبان لڑکھڑا رہی تھی جیسے شراب پی رکھی ہو۔ بولے: ''آج میں بے حد خوش ہوں، آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ اتنی خوشی مجھ اکیلے سے سنبھالی نہیں جاتی۔''

یہ اچانک ملنے والی نعمت یہ تھی:

''مجھے پتا لگ گیا ہے کہ مجھے کب مرنا ہے۔''

"تو کب مرنا ہے؟" احمد بشیر نے پوچھا۔

فرمانے لگے:

"یہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا مگر آپ کو اجازت نہیں کہ کسی اور سے اس واقعے کا ذکر بھی کریں۔"

"مگر ابھی کچھ مہلت تو ہے؟"

"ہاں ابھی مہلت ہے اور اتنا اور بتا دوں کہ میری موت ممتاز مفتی سے پہلے آئے گی اور یہ بات ممتاز مفتی تک نہ پہنچے۔"

احمد بشیر لکھتے ہیں کہ وہ اس قدر مدہوش اور خوش تھے جیسے بیساکھی پر سکھ شراب کی پوری بوتل پی کر مستی میں آجاتے ہیں۔

احمد بشیر نے تو جو دیکھا اور سنا، سچ لکھ دیا۔ شہاب صاحب کی مستی بھی سمجھ میں آتی ہے کہ وہ جذب کی حالت میں ہوں گے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے لوح و قلم پر لکھے فیصلے کیسے پڑھ لیے؟ فرض کریں یہ ان کا وہم وگمان تھا تو پھر انتہائی خوشی کس بات کی تھی؟ کیا انھوں نے اگلے جہان کی خوب صورت جنت دیکھ لی تھی؟

شہاب صاحب کا یہ راز سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر کوئی جان سکتا ہے تو اشفاق احمد خاں صاحب ہی جان سکتے ہیں۔ پر وہ بتائیں گے نہیں۔ کسی میں ہمت ہے تو ان سے پوچھ لے۔

چھوٹا آدمی

میری گاڑی کو کوئی ٹکر مار دے اور قصور دوسرے فریق ہی کا ہو تو مجھ میں ہمت نہیں کہ لڑائی مول لے سکوں اور اپنے نقصان کا ازالہ کرا سکوں۔ بلکہ الٹا یہ ہوگا کہ دوسرا فریق میری جیب سے اپنی گاڑی کا نقصان بھی پورا کرے گا اور گالیاں دیتا ہوا وہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ میں گھر آ کر سرہانے کو گھونسے مار مار کر اپنا غم و غصہ کم کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ اس لیے کہ میں چھوٹا آدمی ہوں۔

میری کار چوری ہو جاتی ہے۔ میں تھانے میں رپورٹ کراتا ہوں تو تھانے دار انکار کر دیتا ہے۔ میں سر پیٹ کر گھر آ کر بیوی کے طعنے بھی سنتا ہوں۔ نقصان کو بھی روتا ہوں مگر کر کچھ نہیں سکتا۔ میرے Contacts نہیں ہیں کہ تھانے دار کی پیٹی اتروا سکوں یا چوری ہوئی کار کو ڈھونڈنے میں حکومت کی مدد لے سکوں۔ میں تھانے دار کے خلاف عرضی لکھ کر اس کے ایس پی کے پاس شکایت کر سکتا ہوں مگر نہ ایس پی میرا واقف ہے نہ ڈی آئی جی اور نہ ہی آئی جی۔ مجھے معلوم ہے میری عرضی کا کچھ نہیں بنے گا۔ میرے کالج کے ساتھی اور سروس کے دوران ہم سفر دوست جوان محکموں میں تھے، وہ ریٹائر ہو چکے ہیں اور ان میں بیشتر شاید میری ہی طرح بے بس ہوں۔

میں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کے امتحان میں پنجاب میں ٹاپ

کیا۔ امریکہ سے پڑھا۔ انٹرنیشنل کانفرنسوں میں پاکستان کو represent کیا۔ ساری عمر صاف ستھری، سیدھی سادی نوکری کی۔ میرے وزیر، ایم این اے اور ایم پی اے دوست نہیں تھے۔ میں اپنے لیے سفارش کرنے یا کروانے کو ناجائز سمجھتا تھا۔ 21 گریڈ نہ جانے کیسے مل گیا۔ چھوٹے آدمی کے contacts نہیں ہوتے۔ چھوٹا آدمی سفارش نہیں کرا سکتا۔

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

میں نے اس سسٹم سے ہار مان لی ہے۔

میرے ایک بزرگ دوست کہا کرتے ہیں کہ اپنے گھر کمرے میں بیٹھ رہنے ہی میں عافیت ہے۔ وہ سچ کہتے ہیں لیکن اگر ڈاکو گھس آئیں۔ آپ کو لوٹ بھی لیں اور جاتے جاتے رپورٹ نہ کرنے کی دھمکی بھی دے جائیں تو سچ مان لیں رپورٹ نہ کرنے ہی میں عافیت ہے۔ نہ جانے میرے جیسے کتنے چھوٹے لوگ ساڑھے تیرا کروڑ آبادی میں رہ رہے ہیں۔

آج کل شادی کا موقع ہو یا جنازے کا، پہلا سوال کریں گے کہ کتنے لوگ آئے ہوئے تھے۔ کون کون آیا تھا۔ وی آئی پی کتنے تھے۔

مجھے اپنے چھوٹا ہونے کا احساس یا دکھ بالکل نہیں ہے لیکن یہ سوچ کر کہ میرے جنازے میں تو شاید بہت کم لوگ آئیں گے اور میری اولاد کو میرا چھوٹا ہونے کا طعنہ سننا پڑے گا۔ میری تو خواہش ہوگی کہ مت بتائیں کسی کو۔ چپ چاپ داب دیں۔ نہ قل کریں نہ چالیسواں۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

ساری عمر انسان پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے کہ عزت برقرار رہے۔ اب یہ بات بھی اپنے بس کی نہیں رہی۔

میرا ایک دوست پندرہ سال ورلڈ بینک میں نوکری کر کے بڑے ارمانوں اور

چاؤ سے پاکستان آیا کہ بڑھاپا سکون سے گزرے گا۔ ایک دن دوپہر کو میرے پاس آیا اور آتے ہی پانی مانگا اور سکون کی کوئی گولی مانگی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد جب اس کی سانس میں سانس آئی تو کہنے لگا: ''یار تم لوگ یہاں کیسے رہ رہے ہو۔ یہ سوسائٹی کدھر جا نکلی ہے؟''

میں نے پوچھا آخر ہوا کیا؟

کہنے لگا: ''میں آج اپنی نئی کار پر ایک One way روڈ پر جا رہا تھا کہ دوسری طرف سے چند لوگ پجارو میں تیزی کے ساتھ آرہے تھے۔ سڑک تنگ تھی۔ میں نے زور سے بریک لگائی۔ ڈیش بورڈ سے میرا سر ٹکرایا اور مجھے چکر آ گیا۔ پجارو والے ہنسنے لگے۔ میں نے صرف اتنا کہا:

''آپ کو دکھتا نہیں کہ یہ One way ہے۔'' تو وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ کہنے لگے:

''یہ تمہارے باپ کا One way ہے؟''

میں نے کہا: ''ایک تو الٹے آرہے ہو۔ کم از کم بدتمیزی تو نہ کرو۔''

میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ نیچے اتر آئے اور مجھے دھکے اور گالیاں دینی شروع کر دیں۔ میں صرف اتنا کہہ سکا کہ میرے سفید بالوں کا تو خیال کرو۔ کیا تم نے حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نہیں سنی کہ کسی شریف مسلمان کو رسوا کرو گے تو جہنم کے کتے تمھیں پھاڑ کھائیں گے۔''

کہنے لگے: ''چل اوئے چل، دفعہ ہو۔'' ایک پولیس والا سامنے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ جاتے ہوئے اس کو کہنے لگے کہ اس بابے کے کاغذات چیک کرو اور وہ میری طرف لپکا۔ میں اپنی جان بچا کر تمھارے پاس ستانے کے لیے آیا ہوں تاکہ تھوڑا سکون ہونے پر گھر جا سکوں۔

یہ واقعہ سنانے کے بعد مجھے پوچھنے لگا کہ یار یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں۔ چوری، سینہ زوری اور پولیس بھی ان کے ساتھ۔

Rekhta Download.com

میں ہنس پڑا۔ میں نے کہا: بھائی صاحب وہ بڑے لوگ تھے اور تم چھوٹے آدمی ہو۔

ایک سال کے بعد میرا دوست امریکہ واپس چلا گیا۔

اس تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔

میں قدرت اللہ شہاب صاحب کا فین ہوں۔

اشفاق احمد خاں صاحب نے ان سے متعلق ان کے آخری دنوں کا ایک واقعہ لکھا ہے۔

شہاب صاحب دن نکلے تھوڑی سی سیر کے لیے نکلا کرتے تھے۔ اکثر پاجامہ کرتا میں ہوتے۔ ان کو انجائنا کا درد ہوتا تو وہ سڑک ہی پر کہیں بیٹھ لیتے یا ٹھہر جاتے۔ وصال سے چند دن پہلے وہ سیر کو نکلے اور ایسے ہی ٹھہر گئے تو وہاں چند بچے کھیل رہے تھے۔ انھیں فقیر سمجھ کر ایک بچہ بھاگتا ہوا ان کے پاس آیا اور کہنے لگا:

''بابا، بابا، آپ نے پیسے لینے ہیں یا آٹا؟''

شہاب صاحب خوشی سے جھوم اٹھے۔ کہنے لگے:

''دونوں''

لڑکا اپنی کوٹھی میں گیا۔ کچھ دیر کے بعد آیا اور کہنے لگا:

''بابا، اماں کہتی ہے آٹا نہیں ہے۔ یہ اٹھنی لے لو۔''

کہتے ہیں شہاب صاحب کو یہ اٹھنی اتنی اچھی لگی جیسے کوہِ نور مل گیا ہو۔ انھوں نے کہہ بھی دیا کہ آج داتا نے میری جھولی ایک بچے کے ہاتھوں بھر دی۔

سوچ سوچ کا فرق ہے کہ آپ کی سوچ کس لیول پر ہے۔

پروانہ اور بھنورا

ایک ان ہونی بات ہوگئی۔ پروانے اور بھنورے کا ٹاکرہ ہوگیا اور آپس میں گپ شپ شروع ہوگئی۔ بھنورا کہنے لگا:

''یار، ہم دونوں کس خوب صورت انداز سے اڑتے ہیں۔ رفتار اور اڑان ایک جیسی ہے۔ میں پھولوں پر لپکتا ہوں۔ تم شمع کے دیوانے ہو۔ دونوں میں ہی بڑی خوبیاں ہیں۔ آؤ، دوستی کرلیں۔ تم پھولوں سے لطف اندوز ہونا میں شمع سے دل بہلاؤں گا۔

پروانہ بولا: ''پھول بہت خوب صورت ہیں لیکن مجھے ان سے دلچسپی نہیں۔ لیکن مجبور کرتے ہو تو چلو تمھاری بات مان لیتا ہوں۔''

بھنورا بھوں بھوں کرتا اڑا۔ کبھی اس پھول پر، کبھی اس پھول پر۔ پروانے کو بھی گھسیٹتا چلا گیا۔ آخر تھک گئے تو ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ آرام کرنے لگے۔

شام ہوئی تو پروانے نے بھنورے سے کہا کہ یار دیکھنا شمع جلی ہے یا نہیں۔

بھنورا گیا اور کچھ دیر کے بعد بھوں بھوں کرتا واپس آ گیا اور کہنے لگا:

''ہاں، شمع جل گئی ہے۔''

پروانے نے سر اٹھا کر کہا:

''میری تیری دوستی نہیں ہو سکتی۔ تم روشن شمع دیکھ کر زندہ واپس کیسے آ گئے؟''

RekhtaDownload.com

RekhtaDownload.com

علم نجوم اور دلچسپ پیشین گوئیاں

جوتش، علم نجوم

RekhtaDownload.com

مستقبل کا حال جاننے کے لیے انسان ازل سے ہی دلچسپی رکھتا ہے۔ سکندرِ اعظم اپنی فوج کو Move کرنے سے پہلے ایک مجذوب لڑکی سے اجازت لیتا تھا۔ نپولین نے جوتشی ساتھ رکھا ہوتا تھا۔ ہٹلر جیسے ڈکٹیٹر کے مشہور جنرل گوئبل نے Nostra damis کی پیش گوئیوں کو اپنی مرضی کے مطابق Interpret کرا کر فرانس میں ہوائی جہازوں کے ذریعے لوگوں کو پہنچایا تاکہ ان میں بددلی پھیلائی جا سکے۔ اس کا چرچا اور اثر اتنا ہوا کہ برطانیہ کی ہسٹری میں پہلی دفعہ وار آفس میں ایک آفیشل astrologer مقرر کیا گیا مقصد اس کا یہ تھا کہ وہ انھیں پیش گوئیوں کی مختلف Interpretation کروا کر لوگوں تک پہنچائے تاکہ ان کا moral ہائی رہے۔

یہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ پریکٹیکل لوگ، سکندرِ اعظم جیسے، نپولین جیسے ہی نہیں بلکہ جرمنی اور برطانیہ جیسی حکومتیں بھی علم نجوم سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔

نجومی سے ملاقات کا سادا مفہوم بالکل معمولی نوعیت کا مشورہ لینا ہوتا ہے مثلاً ''کیا میں فلاں فلاں سے شادی کر لوں؟'' یا ''کیا فلاں bussiness میرے لیے اچھا رہے گا؟'' وغیرہ وغیرہ۔

اکثر ایسے سادا سوال ہوتے ہیں کہ ان کا جواب ''ہاں'' یا ''ناں'' میں دے کر نجومی فارغ ہوسکتا ہے۔ یہ اتنا آسان ہے جیسے طوطے سے فال نکلوائی جائے۔

لوگوں کی سادگی دیکھئے کہ وہ طوطے سے فال نکلوانے میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ تبھی تو طوطے کے مالک کی روزی چلتی ہے۔

اس میدان میں پہلے تو وہ جعلی پیر، پامسٹ اور علم جعفر کے خود ساختہ ماہر آتے ہیں۔ علم نجوم اگر واقعی حقیقتاً کچھ ہے تو کم از کم ان لوگوں کو اس کی اے بی سی بھی نہیں آتی۔ جھوٹ اور ڈھکوسلے سے کام چلاتے ہیں۔ یہ بات تو طے ہے کہ ان کے پاس وہی جاتا ہے جسے کوئی پرابلم ہو، غم، دکھ اور پریشانی میں الجھا ہوا انسان جب ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو یہ پھر ہر ایک کی حالت کے مطابق ایسی لچھے دار گفتگو کرتے ہیں کہ وہ مطمئن ہو کر لوٹتا ہے۔ بعد میں اس کو پتہ چلتا ہے کہ اس کا کام بھی نہیں ہوا اور قسمت بتانے والے نے اسے لوٹ بھی لیا ہے۔

ان میں اکثر بہت چالاک ہوتے ہیں۔ اپنے پروں پر پانی بھی نہیں پڑنے دیتے مثلاً ایک عورت کسی پیر کے پاس جاتی ہے کہ سائیں میرا خاوند مجھ سے اچھا سلوک نہیں کرتا۔

پیر صاحب مشورہ دیتے ہیں اور کوئی وظیفہ پڑھنے کے لیے کہتے ہیں۔

رخصت ہوتے وقت سائل کو نصیحت کرتے ہیں: ''بی بی، خیال رکھنا۔ وظیفہ کرتے وقت تمھیں بندر کا خیال نہ آئے۔''

اس بیچاری عورت کے لیے یہ وظیفہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ وظیفے کے وقت وہ سب کچھ بھول سکتی ہے مگر بندر کو نہیں بھول سکتی۔ فرض کر لیں کہ اس نے بندر کو خیال سے نکال بھی دیا، دن رات وظیفہ بھی کیا لیکن خاوند کا رویہ نہیں بدلا۔

بیچاری پھر پیر صاحب کے پاس آتی ہے تو وہ قصور بندر کے ذمہ ڈال دیتے ہیں اور کوئی نئی مشق دے دیتے ہیں۔

پامسٹوں کے پاس بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ اکثر اشتہار دیتے ہیں اور

Promise کیا ہوتا ہے کہ ''ہمارے پاس تشریف لائیں، محبوب آپ کے قدموں میں ہوگا۔''
عقل کیسے مان سکتی ہے کہ پامسٹ ایسے کر سکتا ہے مگر لوگ پھر بھی ان کے پاس بھاگے جاتے ہیں۔

علم نجوم میں میری دلچسپی 45 سال پرانی ہے۔

1954ء میں ایک دلچسپ آرٹیکل پڑھنے کے بعد علم نجوم خاص طور پر پامسٹری میری Hobby بن گئی۔ اس عرصۂ دراز میں میں نے علمِ نجوم کے ہر شعبہ میں جھانک کر حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی۔ یہ بات تو انگلی کو سمندر میں ڈالنے والی ہے لیکن اس کو Rational طریقے سے پرکھنے کی کوشش تو ضرور ہونی چاہیے۔

قابلِ ذکر Fields جن میں Predictions کی جاسکتی ہے، وہ ہیں۔

1:۔ Astrology

2:۔ Phamistry

3:۔ Vision, Trance, or Intution and Dreams

4:۔ Spiritual Approach

5:۔ Revelation

(Tarif cards اور علم جفر وغیرہ اب اتنی کامن نہیں رہے، اس لیے چھوڑ رہا ہوں)

RekhtaDownload.com

Astrology

Moving Finger writes

1954ء میں ایک انگریزی اخبار Civil & Miltary Gazet نکلا کرتا تھا۔ ایک اسٹینڈرڈ اخبار تھا جیسے آج کل ڈان، نیوز یا نیشن ٹاپ کے اخبار سمجھے جاتے ہیں۔

ایک روز ایک دلچسپ آرٹیکل چھپا اس کا عنوان تھا، Moving finger writes۔ اس کے لکھنے والے کوئی کرنل مرزا تھے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ ان کی اپنی زبانی بیان کروں جو انھوں نے لکھا:

”1938-39ء میں میری پوسٹنگ دہلی میں تھی۔ اس وقت میں لیفٹیننٹ تھا۔ ایک دفعہ میں اور میرے ایک دوست نے چھٹی لی اور تفریح کے لیے بمبئ گئے۔

ان دنوں بمبئ میں ہندوستان کے ایک مشہور جوتشی ہوتے تھے۔ ہم دونوں اس کے پاس گئے۔ جوتشی نے ہم سے بھاری فیس لے کر ہر ایک کو پانچ پانچ بند لفافے دیئے۔ ہر لفافے کے اوپر مستقبل کی کوئی date لکھی تھی۔ لفافے دینے کے بعد کہنے لگا: ”یہ میں نے خصوصی اہمیت کے event جو آپ کی زندگی میں آنے والے ہیں تحریر کر کے بند کر دیے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ آپ نے مقررہ تاریخ سے پہلے لفافہ نہیں کھولنا۔ جس دن جب بھی تحریر کردہ date آئے گی۔ اس دن آپ لفافہ کھول کر پڑھ سکتے ہیں۔“

میں اپنے دوست کو کوسنے لگا کہ کیا فائدہ اتنے روپے ضائع کرنے کا۔ اتنے مہینے، اتنے سال لفافوں کو لے کر بیٹھے رہیں گے۔ آخر جو ہو چکا وہ ہو چکا تھا ہم واپس دہلی آ گئے۔

RekhtaDownload.com

پہلی ڈیٹ

میں نے لفافہ کھولا، اس میں لکھا تھا:

''آپ کی ٹرانسفر ہو جائے گی۔''

دفتر میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ دس بجے، گیارہ بج گئے۔ ایک بج گیا۔ میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ ابھی آدھے گھنٹے میں چھٹی ہو جائے گی۔ جوتشی جھوٹا تھا۔ ڈیڑھ بجے دفتر سے اٹھنے لگا تو کمانڈر نے بلا کر مجھے اسی روز آسام جانے کے آرڈرز تھما دیئے۔ پیشین گوئی سچی نکلی۔

RekhtaDownload.com

دوسری ڈیٹ

دوسرا لفافہ صبح کھولا، تو اس میں تھا:

''آج موت کا منہ دیکھو گے۔ نہ زمین پر نہ پانی میں، لیکن بچ جاؤ گے۔''

آسام ان دنوں war area تھا۔ ہم چھوٹے ہوائی جہاز میں سفر کر رہے تھے کہ جہاز کو کسی دشمن کی گن نے نشانہ بنالیا اور ہمیں پیراشوٹس سے کودنا پڑا۔ اسی دن دوپہر کے بعد میرا پیراشوٹ درخت میں اٹک گیا۔ موت سے بچ کر میں درخت کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ یہ تھی دوسرے لفافے میں کی گئی prediction۔

Rekhta Download.com

تیسری ڈیٹ

اتوار کا دن تھا۔ صبح لفافہ کھولا تو اس میں لکھا تھا۔

''آج تم اپنی future wife سے ملو گے۔''

اس دن دو تین families نے picnic کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ میں بھی invited تھا۔ وہاں picnic میں یا تو خالائیں اور پھوپھیوں جیسی خواتین تھیں یا teen age سے بھی کم لڑکیاں۔ میں نے سوچا کہ اس پیشین گوئی میں جوتشی سے ضرور بھول ہوگئی ہے۔ لیکن ٹھیک دس سال بعد انھی بچیوں میں سے ایک بڑی ہو کر میری بیوی بن گئی۔

RekhtaDownload.com

چوتھی ڈیٹ

1947 تھا۔ لفافہ کھولا تو لکھا پایا:

"تم وطن بدل لو گے۔"

پاکستان بنا تو میں ہندوستان سے پاکستان آ گیا۔

پانچواں بند لفافہ ابھی میرے پاس تھا۔ 1951ء کے کسی مہینے کی تاریخ اس پر درج تھی۔ اس جوتشی کی چار predictions اتنی صحیح نکلی تھیں کہ میرے دل میں اس کو ملنے کا اشتیاق جنون کی حالت اختیار کر گیا۔ مشکلوں سے ویزا ملا۔ آخر بمبئی پہنچا اور ہوٹل میں قیام کیا۔

ReKitaDownload.com

پانچواں لفافہ

پچھلی رات ہوٹل میں قیام کے بعد صبح اٹھا تو یہ وہی date تھی۔ لفافہ کھولا تو اس کو پڑھ کر دنگ رہ گیا۔ لکھا تھا:

''آج تم مجھے پھر ملنے آؤ گے۔''

دل میں جوتشی کی accuracy کو admire کرتے ہوئے ٹیکسی لے کر اس کے ایڈریس پر پہنچا تو وہاں بہت سے لوگ اور پولیس موجود تھی۔ میں نے پوچھا تو معلوم ہوا، آدھی رات کو کوئی جوتشی کو قتل کر گیا ہے۔

دوسروں کی قسمت کا حال بتانے والا خود اپنی قسمت نہ جان سکا۔''

یہاں پر کرنل صاحب کا آرٹیکل ختم ہو گیا۔

اس کو پڑھنے کے بعد ان علوم میں میری دلچسپی اتنی بڑھی کہ آج تک ان سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔

پاکستان میں نام کا کوئی astrologist نہیں۔ دو تین بار ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں متعلقہ لوگوں سے ملا۔ کتابیں کھنگالیں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ صحیح اور سچا کوئی علم اگر ہے یا تھا بھی تو وہ آج سے ستر اسی برس پہلے تھا۔ جو کم لوگ اس میں مہارت رکھتے تھے وہ مرتے

وقت یہ علم ساتھ ہی لے گئے۔ ممکن ہے وہ حاسد تھے کہ جو علم انھیں معلوم ہے وہ دوسروں کو نہ پہنچائیں۔

ویسے ہندوستان میں ہر محلے میں ایسے بہت سے پنڈت ہیں جو پیدا ہونے والے کی جنم پتری بنا دیتے ہیں۔ شادی وغیرہ کا مہورت نکالتے ہیں۔ ان کا سچ جھوٹ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ بہرحال جس علم سے جوتشی نے ہمارے کرنل صاحب کو بتایا اس میں سچ ضرور تھا۔ بشرطیکہ کرنل صاحب نے پورا سچ بتایا ہو مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ جوتشی کو خود اپنی قسمت کا حال معلوم نہ تھا۔ کیا اسٹرالوجی کو half truth کہیں؟

RekhtaDownload.com

Nostra Damis

Prophecies of Nostra Damis بہت مشہور ہوئیں۔ اس مضمون پر فلم بنی۔ انٹرنیشنل میڈیا میں بہت چرچا ہوا اور اب تک ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ناسٹراڈیمس گو ایک ڈاکٹر بنا لیکن بچپن سے ہی Occultism میں بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ اس پر ریسرچ کرنے والے بھی اب کہتے ہیں کہ prophecies کے بجائے اس کے لکھے کو predictions کہنا زیادہ موزوں ہے۔ Astrology اس کا چہیتا مضمون تھا اور اس پر اس وقت کی تمام معلومات اس نے اکٹھی کر رکھی تھیں۔ اس کی ہر تیسری عبادت میں ستاروں کا ذکر آتا ہے۔

وہ بچپن ہی سے gifted تھا اور معمولی معمولی باتوں میں بھی اس کا کہا صحیح ہوتا۔ ایک دفعہ وہ اپنے انکل کے پاس گیا ہوا تھا تو اس کے اس gift کا امتحان لینے کے لیے اس کے چچا نے دو سور کے بچے دکھائے۔ ایک کالا اور ایک سفید۔ اور پوچھا ان کی قسمت میں کیا ہے؟

ناسٹراڈیمس نے کہا کہ سفید سور کو آپ کھائیں گے اور کالے سور کو بھیڑیا کھائے گا۔

اس کے چچا نے اس کا کہا جھوٹ ثابت کرنے کے لیے باورچی کو بلایا اور

کالے سور کو پکانے کا آرڈر دیا۔

رات کو کھانے کی میز پر چچا نے فخر یہ کہا: ''دیکھو، تم نے جھوٹ کہا تھا۔ ہم کالا سور کھا رہے ہیں۔''

ناسٹراڈیمس نے بغیر جھجک کے فوراً جواب دیا۔

''نہیں انکل آپ سفید سور کھا رہے ہیں۔''

چچا فوراً کچن میں گیا اور باورچی کو ڈانٹا کہ سچ سچ بتائے۔ باورچی نے کانپتے ہوئے جواب دیا کہ جناب کالے سور کے گوشت کو صاف کر کے پکانے سے پہلے میں ذرا اوجھل ہوا تھا کہ وہ بھیڑیا لے گیا۔ آپ کے لیے ڈش بنانے کے لیے مجھے سفید سور پکانا پڑا۔

ناسٹراڈیمس کی Astrology میں مہارت کا اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے یہ تھیوری کہ زمین گول ہے اور سورج کے گرد گھومتی ہے کو سچا قرار دیا حالانکہ صرف سو سال کے وقفے میں Galileo کو یہی کہنے پر سزا دی گئی تھی۔

ناسٹراڈیمس کی پیشین گوئیاں پڑھ کر اس کے معنی نکالنا نہایت دشوار ہے۔ عام آدمی اس کو انٹ شنٹ ہی سمجھے گا۔ اس کو ماننے والے اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ وہ ڈر گیا تھا۔ ایسی باتیں چرچ کو بہت ناپسند تھیں۔ کچھ ہی عرصہ پہلے جون آف آرک کو ایسی حرکات پر زندہ جلا دیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے جان بوجھ کر مشکل اور آسانی سے نہ سمجھ آنے والی تحریریں لکھیں۔

ناسٹراڈیمس نے بہت سی پیشین گوئیاں تحریر کیں ان میں بہت تھوڑی آپ بھی ملاحظہ کریں۔

پہلی پیشین گوئی

"Beasts wild with hunger will cross the rivers. The greater part of battle will be against Hister. He will cuase great men to be dragged in a cage of iron, when the son of Germany observes no law."

چار سو سال پہلے لکھی گئی اس عبارت کو لوگ لے اڑے کہ یہ عالمی جنگ دوم کی بالکل درست پیشین گوئی ہے۔ ہٹلر کے بجائے ہسٹر لکھنا معمولی بات ہے۔

RekhtaDownload.com

دوسری پیشین گوئی

امریکہ کے صدر نکسن اور واٹر گیٹ سکینڈل سے متعلق یار لوگوں نے اس کی ایک اور عبارت ڈھونڈ لی۔ وہ ہے:

The great senate will see the parade for one who afterward will be driven out, vanquished. His followers will be there at the sound of his triumph (a trumpet) their possessiens for sale, enemies driven out.

ماننے والے کہتے ہیں کہ دیکھا، نکسن نے اپنے "Memoirs" لکھ کر بیچے۔ ناسٹراڈیمس یہاں تک کہہ گیا تھا۔

تیسری پیشین گوئی

معنی نکالنے والوں کے قربان جائیں۔ ان کو جو بھی Important لگتا ہے اسی کے متعلق ناسٹراڈیمس کی عبارت ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ ہالی وڈ کی ایک ایکٹرس ہوتی تھی جس کا نام تھا مس گریس (Grace)۔ اس نے منا کو کے ruler کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ پیشین گوئی یہ تھی۔

With blood and famine even greater calamity; seven times it approaches the sea shore. Monaco, from hunger, captured, in captivity. The great golden one caught, in an iron cage.

وہ کہتے ہیں کہ princess گریس، گولڈن movies میں کام کرتی تھی۔ اس کے بال گولڈن تھے اور اس کی لائف گولڈن تھی۔ کار کے accident میں مری جو کہ لوہے کا cage تھا۔

مس گریس talented اور خوب صورت تو تھی ہی۔ چار سو سال پہلے شاید ناسٹراڈیمس کو اس کا خیال آ گیا ہو۔

RekhtaDownload.com

چوتھی پیشین گوئی

After great misery for mankind even greater approaches when the great engine of the centuries in renewed. It will rain blood, milk, famine, war and disease. In the sky will be seen a fire, dragging a tail of sparks.

اس کو Interpret کرنے والے عالمی جنگ دوم کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔
ہیروشیما میں ایٹم بم سے خون اور دودھ اچھلا جس کی بارش گری۔

RekhtaDownload.com

پانچویں پیشین گوئی

Anti christ will very soon annihilate the three.

RekhtaDownload.com

چھٹی پیشین گوئی

The world in nearing its final period, Saturn will again be late on his return. The empire will shift towards a black nation.

پانچ اور چھ کی پیشین گوئیاں مستقبل کے بارے میں ہیں اور بھی بہت سی ہیں۔
ناسٹراڈیمس کی اکثر پیشین گوئیوں میں ستاروں کے نام آتے ہیں جس سے یہ شک مضبوط ہوتا ہے کہ وہ سارا معاملہ astrology یعنی ستاروں کے علم کی مدد سے دیکھتا تھا۔ رہی بات ان کی پیشین گوئیوں کے سمجھنے کی تو جس کا جو دل چاہے وہ اپنی مرضی سے حسب خواہش مطلب نکال لے۔

rekhtadownload.com

Jeane Dixon

دورِ حاضر کی ایک امریکن عورت جین ڈکسن بہت مشہور ہوئی ہیں۔ ان کا اپنا کہنا ہے کہ اس کو تمام معلومات خدا کی طرف سے آتی ہیں۔ اس کے مطابق وہ پہلے جان چکی تھی کہ:

☆...... ہندوستان تقسیم ہوگا۔

☆...... مہاتما گاندھی کو مارا جائے گا۔

☆...... چینCommunist ہو جائے گا۔

جین ڈکسن اپنی کتاب میں لکھتی ہے کہ اس نے ایک دوست کے ذریعے سے امریکن پریذیڈنٹ جان ایف کینیڈی کو کہلوانا چاہا کہ وہ Dallas نہ جائیں لیکن چونکہ یہ علم جین کو خدا سے reveal ہوا تھا اس لیے کینیڈی نے مرنا ہی مرنا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی رابرٹ کینیڈی کی موت ٹل سکتی تھی کیونکہ اس سے متعلق اس نے صرف vision دیکھا تھا۔ وہ revealation نہیں تھی۔ گویا وہ خدا کا فیصلہ نہیں تھا بلکہ اس کو مارنے والوں کا فیصلہ تھا۔ جین نے رابرٹ کو مل کر وارن کرنے کی بڑی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔

کہتے ہیں کہ جین ڈکسن بظاہر ایک مذہبی عورت ہے لیکن اس کا دعویٰ کہ اس کو revealations خدا کی طرف سے ہوتی ہیں اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ وہ صحیح نہیں ہے۔ وہ اور

ناسٹراڈیمس دونوں سچے ثابت نہیں ہوتے ہیں۔

ناسٹراڈیمس نے anti christ کے آنے کی خبر دی تھی جس سے متعلق جین ڈکسن کا دعویٰ تھا کہ وہ 1962ء میں پیدا ہو چکا ہے اور 29 برس کی عمر میں ظاہر ہوگا۔ اس کا مطلب ہے 1991ء میں دنیا کو اس سے متعلق معلوم ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ بات غلط ثابت ہوئی۔

جین ڈکسن نے جو دوسری پیشین گوئیاں کی تھیں وہ یہ کہ:

☆...... 1999ء میں خوف ناک جنگ ہوگی۔

☆...... چین 2000ء میں Middle East پر حملہ کر دے گا۔

☆...... روس عیسائیت کی طرف لوٹ آئے گا۔

یہ سب بڑی بڑی دلچسپ پیشین گوئیاں تھیں۔ ان کے ظہور پذیر ہونے کے سال بھی دیے گئے، مگر یہ سب غلط نکلیں۔ revealations صرف خدا کے رسولوں اور نبیوں کے لیے ہے۔ جین ڈکسن جیسی مخلوق کے لیے ہرگز نہیں۔

RekhtaDownload.com

Visions, Trance or Dreams

جو وقت گزر گیا وہ ہماری یادیں بن جاتا ہے۔ موجودہ وقت اصل ہے، حقیقت ہے۔ مستقبل میں آنے والا وقت ہماری آرزوئیں، ہمارے خوف کے ہیولے ہیں۔

کسی طریقے سے اگر ہم موجودہ وقت سے نکل کر اس ضمن میں مائنڈ میں یا خیالات میں یا احساسات میں مستقبل میں peep کر سکیں تو وہ prediction ہوگی۔

ایک ذریعہ جو قدرت نے سب کے لیے رکھا ہے وہ ہے سچا خواب دیکھنا۔

اللہ نے انسان کو ایسے بنایا ہے کہ وہ بڑی Cosmos میں رہتے ہوئے خود ایک Mini Cosmos ہے۔ ہر ایک میں شعور کے کئی گوشے ہیں۔ کسی انسان میں کسی گوشے کی خاص شاخ زیادہ develope کر جاتی ہے اور کئی animal level سے تھوڑے ہی اوپر اٹھ سکتے ہیں۔

Vision کا اس فیلڈ میں مطلب ہے کہ جاگتے ہوئے کچھ دیکھنا۔ مائنڈ کے اندر یا باہر، دیکھی جانے والی چیز حقیقت بھی ہو سکتی ہے یا halucination بھی ہو سکتا ہے۔ یہ حالت چند سیکنڈ میں ذائل ہو سکتی ہے یا زیادہ عرصہ بھی رہ سکتی ہے۔ کبھی کبھی غائب سے آواز بھی آ سکتی ہے۔ جون آف آرک کو آوازیں آتی تھیں۔ رس پوٹین شروع شروع میں جنگل میں جا کر

meditate کیا کرتا تھا۔ اسے بھی آوازیں آتی تھیں۔

Trance نیند کی قسم ہے۔ فرق اتنا ہے کہ انسان جیتا جاگتا کسی اور phenomina میں مشغول ہو جاتا ہے۔

RekhtaDownload.com

Trance

edgar cayce trance کی دنیا میں بہت مشہور ہوا۔ اس پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور سب سے مشہور کتاب director of education نے لکھی ہے جو خود P.H.D تھا۔ اس کی کتاب کے تین سے زیادہ edition چھپ چکے ہیں۔ 1989ء میں نیویارک سے۔ 1990ء سے انگلینڈ سے اور پھر 1994ء میں۔

Cayce امریکن تھا۔ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ Bible کو اس نے اتنی بار پڑھا کہ وہ اس کا حافظ بن گیا تھا۔

وہ بچپن سے ہی gifted تھا۔ trance میں جا کر وہ بیماریوں کی تشخیص کر دیتا۔ بیمار لوگوں کا علاج کر دینے کے علاوہ ایسی ایسی پیشین گوئیاں کر دیتا جو حیران کر کے رکھ دیتیں۔

جب وہ trance میں جاتا تو اس کے تمام جسم میں ایک گہری تبدیلی آتی۔ جیسے باڈی کے تمام functions مدھم پڑ چکے ہوں یا جیسے جسم مردہ ہو چکا ہو۔ بعض اوقات اس کو صحیح حالت میں لانے کے لیے کوشش کرنی پڑتی جو اکثر suggestions کے ذریعہ سے ہوتی۔

اس سے پوچھا گیا:

How do you get something you want from

sources distant in time and space?.

اس کا جواب تھا:

One ness

one ness

one ness

ساری reality کا source نہ صرف divine ہے بلکہ تمام events ایک دوسرے سے connected ہوتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ جب خاص conditining سے جس میں اللہ سے دعا اور meditation شامل ہیں، وہ اپنے mind کو dynamic بنا کر subconscious سے superconscious کیفیت میں پہنچ جاتا تو بہت سی حقیقتیں اس کی پہنچ میں آجاتیں۔

اس کو یقین تھا کہ خدا کی مرضی ہی ایک crucial factor ہے اور وہ ٹرانس میں جانے سے پہلے اسی سے دعا کرتا۔

اپنی مرضی کو خدا کی مرضی سے reconcile کرنے کی جدوجہد ہی میں سارا راز ہے۔ یہی اس کا فلسفہ تھا۔

لوگوں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس کی ساری باتیں سچ نکلتی ہیں۔ اپنے لفظوں میں اس کا جواب تھا:

"Man`s pageant must pass and fade, but God works in slower and more secret ways, His blows no trumpet, He rings no bell. He begins from within, seeking His ends by quiet growth.

You ask "Have there been failures?" If there were

not failures, friends, I would he afraid there was some thing super natural about me. I am only human. Humanity is doomed to failure when it trusts in its own weak self, and most of us have that failing."

Cayce کی سٹوری پڑھنے کے بعد اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک مذہبی آدمی تھا۔ اس کا خدا پر ایمان پکا تھا۔ ہوسکتا ہے اس کی دعا میں اثر ہو یا کبھی کبھی اللہ پاک تھوڑا سا غیب کے علم میں جھانکنے کی اجازت دے دیتے ہوں۔ اصل حقیقت تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔

vision یا تو developed ہوسکتی ہے یا inspired ہوتی ہے۔ یہ ان لوگوں میں پیدائشی گفٹ ہوتا ہے جو مشق کے بعد کچھ نہ کچھ اندازے لگا لیتے ہیں۔

جو لوگ اللہ کی یاد میں فنا ہو جاتے ہیں ان کی حس اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ ان کی vision بہت درست ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنا بھید نہیں کھولتے۔

Spiritual Predictions

1981ء میں نیویارک سے ایک رسالہ شائع ہوا جس کا نام تھا: ''ہو''
یہ فقرا کی جماعت نے شائع کیا تھا جس کے ہیڈ خود کو سلطان کہلواتے تھے۔
اس اشاعت کا مقصد اسلام کو پھیلانا ہی نہیں بلکہ لوگوں کو روحانی ترقی کی راہ پر ڈالنا بھی تھا۔

ان کے مرشد کا کہنا تھا کہ دینوی خواہشات سے بلند ہو کر اللہ کا ذکر کیا جائے تو انسان کی روح اتنی لطیف ہو جاتی ہے کہ اس کے لیے ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ آسمانوں میں فیصلے ہوتے وقت وہاں موجود ہو۔ انھوں نے دنیا میں بڑے بڑے فیصلوں سے متعلق اپنا وہاں موجود ہونا بھی بتایا۔ جن واقعات کا انھوں نے ذکر کیا وہ میں چھوڑ رہا ہوں کیونکہ وہ ماضی میں واقع ہو چکے تھے۔ events کے گزر جانے کے بعد کسی کا دعویٰ کہ انھوں نے ان events کی پیش گوئیاں کی تھیں، یقین سے نہیں مانا جا سکتا۔ البتہ مستقبل کی ایک prediction حیران کن تھی۔

1981ء میں روس نے افغانستان پر حملہ کر رکھا تھا اور وہاں کمیونسٹ لوگوں کا بڑا زور تھا۔ روس ایک سپر پاور تھی۔

1981ء میں اس رسالے میں پیشین گوئی لکھی گئی کہ:

RekhtaDownload.com

☆...... ''آسمانوں میں فیصلہ ہو چکا ہے کہ روس یہاں سے صرف منہ کی ہی نہیں کھائے گا بلکہ خود ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔''

سچ پوچھیں تو یہ پڑھ کر میں نے اس وقت رسالہ ایک طرف پھینک دیا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ افغانستان جیسا backward ملک، روس جیسی سپر پاور کو بھگا دے۔

اب آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ یہ پیشین گوئی سچی نکلی یا جھوٹی۔

اس subject پر لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ اس لیے خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔

RekhtaDownload.com

پامسٹری اور میں

چالیس پچاس سال پہلے فاطمہ جناح روڈ (اس وقت کی Queen road) پر ایک کوٹھی کے ساتھ چھوٹی سی annexy ہوتی تھی۔ annexy کیا ایک کمرہ تھا اور سامنے چھوٹا سا برآمدہ۔ اس میں ادھیڑ عمر کا ایک شخص رہا کرتا تھا جس کا نام تھا فقیر شاہ۔ سفید بال، پڑھا لکھا اور ذرا تھتھلا کر بولتا۔ فقیر شاہ اس وقت لاہور کا مشہور پامسٹ تھا۔ ان دنوں نہ appointment لینے کا رواج تھا اور نہ ہی کوئی فیس مقرر ہوتی۔ کوئی گیا کوئی نکلا۔ کسی نے دو روپے دے دیے تو کسی نے پانچ۔

ہم نئے نئے کالج سے فارغ ہوئے چند دوست curiousity کی خاطر اس کے پاس چلے گئے۔ اس نے کسی کو کچھ بتایا کسی کو کچھ۔ میرے لیے بھی انٹ شنٹ مارے مگر میری نگاہیں ان کتابوں پر گڑی رہیں جو اس نے ساتھ سجا رکھیں تھیں۔ میری دلچسپی یہ تھی کہ اگر پامسٹری کوئی علم ہے تو ان کتابوں سے ملے گا۔ بہرحال ہم میں کسی نے بھی اسے seriously نہ لیا۔ ایک آدھ ماہ بعد نوکریاں ملنے پر ہم ادھر ادھر بکھر گئے اور فقیر شاہ کی پیشین گوئیوں سے متعلق نوٹس کبھی compare نہ کیے۔

چھ ماہ پہلے میں نے امریکہ میں مزید پڑھائی کے لیے Education

Department سے آفر ہوئے۔ اسکالرشپ کے لیے انٹرویو دے رکھا تھا۔ ایک روز مجھے اطلاع آ گئی کہ Colorodo یونیورسٹی میں میرا داخلہ ہو چکا ہے اور مجھے پندرہ دن کے اندر اندر امریکہ روانہ ہونا ہے۔ مجھے فارغ کرنے کے لیے جب فائل چیف کے پاس گئی تو اس نے فیصلہ مختلف کر دیا۔ اس نے لکھا کہ اس آفیسر کو مزید پڑھائی کی ضرورت نہیں۔ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ اس کو وہاں Practical Training دلوائے۔ جب چٹھی Education والوں کے پاس پہنچی تو وہ کہنے لگے، آپ کا چیف جھلا ہو گیا ہے۔ ہم تو Universities سے ڈیل کرتے ہیں، وہاں کے محکموں سے نہیں۔ انھوں نے ایسا ہی جواب لکھ کر میرے محکمہ کو بھیج دیا اور ساتھ امریکہ میں اطلاع کر دی کہ میرے جائن کرنے میں کچھ دیر ہو سکتی ہے۔

اب میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ کیا کروں۔ اپنے چیف کے پاس گیا اور عرض کی کہ جناب مجھے جانے دیں لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ سیانوں کے پاس گیا اور ان کا مشورہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ چیف کو اس کے کسی دوست سے کہلواؤ۔ جب میں نے اس پر عمل کیا تو وہاں سے جواب ملا کہ ہم کب اس کو امریکہ جانے سے روک رہے ہیں ہم تو اس کی بہتری کے لیے Practical Training دلوانا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے دعا کی اور ایک بزرگ کے پاس جا کر ان کو بھی دعا کرنے کے لیے عرض کی۔ وہ فرمانے لگے کہ چھوڑ بھائی کس چکر میں پھنس گئے ہو۔ اگر قسمت ہوئی تو چلے جاؤ گے۔ قسمت کا لفظ اور اس کا مفہوم پہلی دفعہ سنا۔

جب بپتا پڑے تو انسان جوتشیوں کا رخ کرتا ہے۔ میں فقیر شاہ کے پاس پہنچا۔ اس کو سارا قصہ سنانے کے بعد میں نے کہا کہ میں نے اپنے سارے جتن لگا لیے ہیں۔ سیانوں کے مشورے بھی کام نہ آئے۔ دعا بھی کارگر نہ ہوئی آپ یہاں قسمت بتانے والے بیٹھے ہیں اب بتائیں۔ فقیر شاہ نے میرا ہاتھ دیکھا اور کہنے لگا تم امریکہ جا رہے ہو۔ کوئی مائی کا لعل روک ہی نہیں سکتا۔ محکموں کی خط کتابت چلتی رہی۔ تین ماہ گزر گئے۔ میں امریکہ تو نہ گیا بلکہ چچوں کی ملیاں پہنچ

گیا جہاں ہائیڈل پاور ہاؤس کی تعمیر میرے سپرد کی گئی۔

امریکہ میں ضرور گیا لیکن اس واقعہ کے تین سال بعد۔ نئے سرے سے اوپن اسکالرشپ میں select ہوا۔ چیف بدل چکا تھا۔ اس دفعہ میرا داخلہ کیلیفورنیا یونیورسٹی میں تھا۔ اب کوئی کیا اندازہ لگائے کہ فقیر شاہ کی پامسٹری ٹھیک تھی یا غلط۔

کسی event کا تین سال آؤٹ ہونا پیشین گوئی کا ستیاناس کر دیتا ہے۔

یہ تو جو ہونا تھا ہو گیا مگر پامسٹری سے مجھے ایسی لگن ہوئی کہ چالیس برس سے اوپر ہو گئے ہیں اس سے دلچسپی نہیں گئی۔

شروع شروع میں نے پامسٹری پر ساری کی ساری کتابیں خرید ڈالیں۔ ان میں جو چند یاد ہیں وہ ان کی لکھی ہوئی تھیں:

1:۔ کیرو

2:۔ بن ہم

3:۔ سینٹ جرمین

4:۔ نوئل جیکوئن

5:۔ میر بشیر

ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا تو ایک مشہور پنڈت کی لکھی ہوئی 'ہست سمدر کا شاسترا' ہاتھ لگی۔

ان کتابوں کو critically پڑھتا گیا۔ اپنی ریسرچ کے لیے مختلف لوگوں کے ہاتھ سٹڈی کرتا رہا۔ اپنی اس ہابی کو خفیہ ہی رکھا پھر بھی جاننے والے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ میں ان کے لیے نہیں بلکہ اپنے knowledge کے لیے ان کا ہاتھ دیکھتا۔

جو کتابیں میں نے پڑھی تھیں وہ اتنی differ کرتی تھیں کہ سر پیٹنے کو دل کرتا۔ حرام ہے کہ کوئی ایک author دوسرے سے ملے۔ کوئی صحت کی بات کرتا ہے۔ کوئی شادی کی اور

کوئی emotional لائف کی۔ event اور عمر کا تعین کرنے میں ہر ایک کا دوسرے سے زمین اور آسمان کا فرق ہوتا۔

اب میں نے یوں کیا کہ جب کسی کے ہاتھ میں کوئی event دیکھتا تو اس کو ہر author کی لکھت سے compare کرتا۔ ساتھ ساتھ عمر اور event کا بھی حساب رکھتا۔ اس طرح Integrated knowledge بڑھ گئی۔ سال ہا سال کے تجربے سے ریڈنگ اور accurate ہوتی گئی اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ پامسٹری science نہیں ہے۔ یہ statistical analysis ہے۔

جن لوگوں میں احساس کی شدت ہو ان کے ہاتھ پڑھنے آسان ہیں۔ واقعات matter نہیں کرتے بلکہ events سے متعلق ہمارا جو reaction ہوتا ہے، وہ ہاتھ میں ریکارڈ ہو جاتا ہے۔

کچھ لوگ strong willed یا بے حس ہوتے ہیں ان کے ہاتھ آسانی سے نہیں پڑھے جاسکتے۔

انسان کا temprament، اس کی صحت، شادی، کامیاب زمانے، دکھی periods وغیرہ بتانا بہت آسان ہے۔ سائنس کی طرح یہ absolute truth نہیں ہے۔ اچھا پامسٹ 90% تک ٹھیک بتا سکتا ہے۔ لیکن اچھا پامسٹ ہونا ناممکن ہے۔ ہاتھوں کی ساخت اور انگلیاں تک بہت کچھ بتا دیتی ہیں۔

مجھے 1969ء میں امریکہ میں Bureau of Reclamation کے ساتھ آٹھ مہینے training کے دوران میں دو ہفتے کے لیے Las Vagus میں قیام کا موقع ملا۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی میں میرا ایک سکھ کلاس فیلو تھا جس سے دوستی ہو گئی تھی۔ وہ امریکہ میں settle ہو چکا تھا اور ان دنوں Las Vagus میں رہتا تھا۔ اصرار کر کے وہ مجھے ہوٹل سے گھر لے گیا۔ ان دنوں Las Vagus میں ایک نیا ہوٹل اور Casino کھلا تھا۔ اس کی publicity

کے لیے ہوٹل والوں نے ایک مشہور ایکٹرس کے دو شو رکھے تھے۔ صرف ایک ہفتہ کے لیے۔ بھاری ٹکٹ تھا۔ غالباً 30 ڈالر جمع ٹیکس۔ ایک مہینہ پہلے اس کی مشہور فلم دیکھنے کے بعد مجھے شوق ہوا کہ اس ایکٹرس کا لائیو شو دیکھوں۔ میں نے سکھ دوست سے ذکر کیا تو وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔ کس واہیات خواہش کے لیے اتنے ڈالر ضائع کرنا چاہتے ہو۔ Las Vagus سے مجھے Denver جانا تھا۔ جب ایک دن رہ گیا تو سکھ کو نہ جانے کیا خیال آیا۔ کہنے لگا: ''یار تم نے مجھے گالیاں ہی دیتے جانا ہے۔ چل تینوں تیری پھوپھی بابرا کے شو پر چھوڑ آؤں۔ شو کے ختم ہونے پر تم کو لے لوں گا۔'' وہ مجھے شو سے ایک گھنٹہ پہلے ہی چھوڑ گیا۔

میں نے ٹکٹ خرید کر سب سے آگے والی میز اور سامنے والی کرسی پر قبضہ کر لیا۔ تین کرسیاں دائیں طرف تھیں اور تین بائیں طرف۔ فرنٹ میں سٹیج تھا۔

اب کیا ہوا کہ دائیں والی کرسیوں پر تین دادی نانی قسم کی تیز طرار عورتیں آ بیٹھیں۔ بائیں طرف تین ٹین ایج لڑکیاں آ دھمکیں۔

دائیں بائیں خواتین کے دونوں گروپ آپس میں خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔ اور میں اپنے آپ کو ایک اج بک کی طرح عجیب سا unwanted اجنبی محسوس کرنے لگا۔

اسی اثناء میں مجھے دائیں والی عورت کے ہاتھوں کی کچھ لکیریں اور انگلیوں وغیرہ کی ساخت کا اندازہ ہو گیا۔

میں نے excuse me کہہ کر اسے basic thumb rules سے دو تین باتیں بتا دیں۔ بے شک میں نے پامسٹری کا ناجائز فائدہ اٹھایا لیکن پانچ منٹوں کے اندر سب ہاتھ بڑھا بڑھا کر مجھ سے پوچھنا شروع ہو گئیں۔ ایسے لگا جیسے وہ مجھ سے بہت impress ہو گئی تھیں۔

شو شروع ہوا تو انٹرول میں میرے ساتھ والی خاتون سٹیج کے پردے کے پیچھے غائب ہو گئی۔ ہانپتی کانپتی excited واپس آئی اور مجھے کہنے لگی: ''میں نے مس بابرا سے تمھاری

بہت تعریف کی ہے۔ شو ختم ہونے پر وہ تمہیں اپنا ہاتھ دکھائے گی۔''

اس میں شک نہیں کہ شو spell bound کرنے والا تھا۔

شو ختم ہونے پر میری ساتھی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچتے ہوئے پردے کے پیچھے لے گئی۔

وہاں بابرا کھڑی تھی۔ کالے سوٹ پہنے ہوئے تین بڑے جسم کے آدمی ساتھ کھڑے تھے۔ شاید منیجر ہوں گے یا gaurds۔

ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی:

''بتاؤ کیا بتا سکتے ہو''

میں نے جواب دیا:

''یہاں لائیٹ کافی نہیں۔''

اپنے منیجر سے بولی:

''اسے کل after noon میں کوئی ٹائم دے دو۔''

''لیکن میں تو صبح Denver جا رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

کہنے لگی: "I will pay you something"

مجھے عجیب لگا اور میں نے فوراً کہا:

"But I am not professional."

"Please your self" کہہ کر وہ ان آدمیوں کے نرغے میں وہاں سے چلی گئی۔ اور میں crowd میں دھکے کھاتا ہوا باہر نکل کر اپنے دوست کو ڈھونڈنے لگا۔

واپسی پر جب میں نے اپنے سکھ دوست کو یہ واقعہ سنایا تو وہ اپنا سر پٹخنے لگا۔

مجھے کہنے لگا: ''تو Denver پرسوں چلا جاتا۔ وہاں تم نے کون سے باپ کے بھائی چاچے کا ولیمہ کھانا تھا۔ بابرا روز کے شو کا ایک ملین ڈالر لے رہی ہے۔ یہ لوگ فراخ دل

ہوتے ہیں۔ کیا پتہ تمھیں دس ہزار ڈالر دے دیتی، فٹے منہ تیرا۔"

بہر حال یہ چانس میں نے مس کیا، اور کچھ نہیں تو اتنی بڑی ایکٹرس سے پانچ دس منٹ کی ملاقات ہی کافی تھی۔

پامسٹری مجھے ہمیشہ "پوٹھی" پڑتی رہی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سوچا کہ اس پر کچھ لکھوں۔ آغاز میں Friday Times میں میرے دو آرٹیکل چھپے تو میرے لیے جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ ہر روز دوستوں کی فرمائشیں آنے لگیں۔ families کی families آنے لگیں۔ ساتھ کافی اور چائے سے تواضع کرو، ساتھ پامسٹری کو نبھاؤ۔ اپنا وقت اپنے ہاتھ سے چھوٹتا دکھائی دینے لگا۔ اجنبی لوگ خاص کر خواتین کے ٹیلی فون آنے لگے کہ جناب فیس لے لیں اور وقت دیں۔ بڑا سمجھا بجھا کر جان چھڑائی کہ جناب میں professional نہیں ہوں۔

اگر آپ کسی پامسٹ کے پاس جائیں تو پہلے اپنی صحیح عمر بتا کر صرف دو سوال پوچھیں۔

(1) کہ میری مالی پوزیشن کیا ہے؟

(2) میری بیوی یا خاوند، محبوب یا محبوبہ کے ساتھ تعلقات کیسے ہیں؟

اگر وہ پامسٹ دوٹوک الفاظ میں ٹھیک بتا دے تو وہاں بیٹھیں ورنہ فیس دینے کے باوجود فوراً وہاں سے اٹھ آئیں۔ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ اگر وہ ان دو سوالوں کا ٹھیک جواب نہیں دے سکتا تو وہ آپ کو کچھ بھی ٹھیک نہیں بتا سکے گا۔

سب سے ضروری سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا future سے متعلق جاننا ضروری ہے؟

اگر کوئی پامسٹ کہہ دے کہ سب اچھا ہے تو آپ وقتی طور پر خوش بھی ہو جائیں گے اور شاید کوشش بھی چھوڑ دیں یا کم کر دیں۔

لیکن اگر آپ سے کہہ دیا جائے کہ اگلے دو سال مشکلیں ہیں، تو آپ کیا کریں

Kitabdownload.com

گے؟ ان مشکلات سے کیسے بچیں گے؟ یہ آپ کو پامسٹ کا باپ بھی نہیں بتا سکتا۔

پانچ یا دس فی صد ہاتھوں میں وجہ identify ہو سکتی ہے لیکن وہاں بھی مشکل ہے۔

میں اپنا تجربہ بتاتا ہوں۔ جب میری چار سال کے قریب سروس تھی تو میں سرگودھا میں ڈسٹرکٹ لیول کا آفیسر تھا۔ نئی نئی پامسٹری پڑھی اور سیکھی ہوئی تھی۔ جب اپنا ہاتھ دیکھتا تو نوکری میں دو اڑھائی سال کا عرصہ نہایت مشکل دیکھتا۔

اچھی خاصی زندگی گزر رہی تھی۔ seniors بھی مجھ سے بہت خوش تھے۔ لیکن مجھے کبھی کبھی فکر لاحق ہو جاتا۔ ایک روز مجھے چھٹی ملی۔ مجھے ویسٹ پاکستان انٹی کرپشن کے محکمہ میں technical advice کے لیے سلیکٹ کیا گیا تھا۔ میرے seniors نے مجھے spare کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن میرے دماغ میں اگلے دو گندے سال گھومنے لگے۔

میں نے سوچنا شروع کر دیا۔ یہاں پر پبلک ڈیلنگ ہے، نہر ٹوٹ سکتی ہے۔ دوسرے مجھے جج کریں گے۔ Anti corruption کے محکمہ میں جا کر دوسروں کو میں جج کروں گا۔

میں نے جائن کرنے کا فیصلہ کر لیا اور مجھے میرا محکمہ نہ روک سکا۔ Anti corruption Directorate جائن کرتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ مجھے تو کالے پانی کی سزا ہو گئی ہے۔ چاروں طرف 007 قسم کے پولیس آفیسرز اور کام لوگوں کو پھنسانا تھا۔

میں مختلف ماحول سے آیا تھا۔ ہر کیس کا جائزہ لے کر سیدھی straight forward رپورٹ کرتا لیکن وہاں کا بابا آدم ہی نرالا تھا۔

اگر میری opinion کیس میں ملوث آفیسرز کو پھانستی تو مان لی جاتی لیکن اگر میرٹ پر ان کے حق میں ہوتی تو disagree ہو کر واپس آ جاتی۔

پالیسی یہ تھی کہ جن جن لوگوں کے خلاف شکایت آتی ہے انھیں چھوڑنا نہیں۔

یہ میرے temperament کے خلاف تھا۔ تو یوں میرے دکھی دو سالوں کا آغاز ہوا۔

پامسٹری کے لحاظ سے میرا پیشگی جاننے کے باوجود کہ دو سال گندے آرہے ہیں میں بچ نہ سکا۔ بلکہ اگر میں پامسٹری نہ جانتا ہوتا تو شاید انٹی کرپشن کا محکمہ جائن نہ کرتا۔ پامسٹری نے مجھے الٹا پھنسا دیا۔

ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔

مستقبل جاننے کی کوشش فضول ہے۔ زندگی میں کئی مقامات پر دو میں سے ایک فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔

کون سا فیصلہ کدھر لے جاتا ہے صرف اللہ کو معلوم ہے۔ اس کا صحیح حل یہی ہے کہ اللہ سے دعا کی جائے۔ بار بار کی جائے کہ وہ ٹھیک فیصلہ کرنے کی توفیق دے۔ نجومیوں اور پامسٹوں کو چھوڑیئے۔ یہ لوگ معاملات الجھا سکتے ہیں، سلجھا نہیں سکتے۔

RekhtaDownload.com

RekhtaDownload.com

روحوں کی باتیں

روحیں

RekhtaDownload.com

روحوں کے بارے میں کئی قصے سنے، کچھ پڑھے بھی، لیکن ایسے محسوس ہوتا رہا جیسے جنوں اور پریوں کی کوئی کہانی سن رہے ہیں۔ یقین کم ہی آتا تھا۔

آدمی اس وقت اٹک جاتا ہے جب سنانے والا معتبر ہو۔

بہت عرصہ پہلے ایک سکھ صحافی دیوان سنگھ مفتون نے کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا ''ناقابل فراموش۔'' سردار صاحب کا اسٹائل ایسے لگتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں لکھ رہے۔ اس میں انھوں نے لکھا کہ ان کے والد کی وفات کے بعد گھر میں اتنی تنگ دستی ہوگئی کہ نوبت فاقوں تک آنے لگی۔ ایک رات ان کی ماں کے خواب میں والد صاحب آئے اور بتایا کہ فلاں صندوق میں کپڑوں کے نیچے اخبار کی تہ میں چھپا کر میں نے سو روپے کے نوٹ رکھے ہیں۔ وہ نکال کر اپنا کام چلالو۔

صبح ہماری ماں نے صندوق کھولا تو اسے بتائی ہوئی جگہ سے واقعی سو روپے مل گئے۔

دسمبر 1985ء میں ''جنگ'' اخبار میں ایک مذاکرہ کی تفصیلات چھپیں۔ اس کا عنوان تھا ''حیات بعد از موت''۔ مذاکرے کے شرکا تھے حنیف رامے، اشفاق احمد خاں صاحب،

بانو قدسیہ، ملک واصف علی واصف اور ان جیسے ہی دوسرے معززین۔ ان کو پہلے ایک فلم دکھائی گئی "Beyond and Back" اور اس کے بعد مذاکرہ شروع ہوا۔

فلم میں دکھائی جانے والے واقعات ایسے تھے جو بہت سی کتابوں اور دوسری فلموں میں بھی آ چکے ہیں۔ موت کے وقت ایک لمبے dark tunnel سے گزرنا، اس کے بعد تیز روشنی، میوزک اور نہایت خوب صورت دنیا میں جانا جہاں فرشتے، بزرگ لوگ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات وغیرہ ہونا۔ کئی stories میں عذاب کے فرشتوں کو بھی دکھایا جاتا ہے۔ یہ تفصیلات وہ لوگ بتاتے ہیں جن کو ڈاکٹر clinically dead قرار دینے کے باوجود کوششوں سے دوبارہ زندہ کر لیتے ہیں۔

مذاکرے میں اکثر لوگوں نے اس possibility سے انکار نہیں کیا۔ بانو قدسیہ نے بتایا کہ دوسری جنگ عظیم میں ان کی ایک گورکھا سہیلی شیریں تھی۔ اس کے شوہر کو وکٹوریہ کراس ملا تھا (جو بانو قدسیہ صاحبہ نے خود بعد میں لندن میں دیکھا)۔ گورکھا لڑکی کے خاوند کا نام تھا پا تھا جو شادی کے بعد جنگ میں چلا گیا۔ چند روز بعد شیریں نے پستول سے خودکشی کر لی۔ اس کی میز پر ایک رقعہ پڑا تھا جس پر لکھا تھا۔ آج پا تھا میرے پاس آئے تھے انھوں نے کہا کہ میں کل جنگ میں مارا جاؤں گا اور مجھے وکٹوریہ کراس ملے گا، تم اسے وصول کرنا۔ میں یہ لکھ کر دیتی ہوں کہ میں اپنے مرے ہوئے شوہر کا وکٹوریہ کراس وصول نہیں کروں گی۔ یہ رابطہ جو پا تھا نے اپنی بیوی سے کیا اس کو کس طرح explain کیا جا سکتا ہے؟

اسی مذاکرہ میں علی اصغر خاں صاحب نے بتایا کہ مولانا احمد علی صاحب کی وفات کے بعد ان کے ذکر پر یا قبر پر جانے پر خوشبو آتی تھی۔

میرے ایک نہایت معزز دوست ہیں جن کے متعلق میں خیال بھی نہیں کر سکتا کہ وہ غلط کہتے ہوں گے۔ وہ لاہور میں رہتے ہیں لیکن چنیوٹ میں ان کا آبائی گھر ہے جو ہمیشہ بند رہتا ہے۔ گھر کے پیچھے ایک پرانی قبر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب بھی وہ گھر کھول کر پچھلے کمروں

میں جاتے ہیں تو خوشبو کے جھونکے آنے شروع ہو جاتے ہیں۔

جنہوں نے ''شہاب نامہ'' پڑھا ہے اس میں جوان کے ساتھ کٹک کے ایک بنگلے میں واقعات پیش آئے وہ انھوں نے ''بملا کماری کی بے چین روح'' کے عنوان سے لکھے ہیں۔

''اٹھارہ سال پہلے بملا کماری الٰہ آباد میں کالج کی ایک طالبہ تھی۔ آئی سی ایس کے ایک اوباش آفیسر نے اس کو ورغلایا اور اسے کٹک میں اسی بنگلہ میں لے آیا۔ شادی اس نے کرنی ہی نہیں تھی لیکن سات ماہ بعد جب وہ ماں بننے کے قریب ہوئی تو ظالم نے اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ لاش کو ڈرائینگ روم کے کونے میں دفن کر دیا۔

اٹھارہ سال بعد جب قدرت اللہ شہاب صاحب نے اسی بنگلہ میں رہنا شروع کیا تو بملا کماری کی روح نے انھیں contact کرنا شروع کیا۔ کبھی بجلی کا سوئچ خود بخود آف اور آن ہو جاتا۔ کبھی دھوئیں کا ایک چھلا نظر آتا۔ انگریزی سینٹ اور حنا کے عطر کی ملی جلی خوشبو پھیل جاتی۔

کچھ عرصہ بعد کسی دوسری بدروح نے شہاب صاحب کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ کبھی پتھر پھینکے جاتے، کبھی گندگی، بہت ڈرانے والی باتیں شروع ہو گئیں۔

بعد میں یہ عقدہ کھلا کہ قاتل خود مر چکا تھا۔ بملا کماری کی روح کی کوشش تھی کہ وہ اپنی ماں کو صحیح صورتِ حال پہنچائے اور اس کی ہڈیوں کو نکال کر اس کے دھرم کے مطابق اس کا کریا کرم کیا جائے۔

قاتل کی روح بملا کی ہر کوشش کو ناکام بنانے میں سرگرم تھی۔

شہاب صاحب کی مدد سے جب لاش والی جگہ کھود کر بملا کی بوسیدہ لاش ماں تک پہنچا دی گئی اور اسے چتا میں جلا دیا گیا تو یہ سارا قصہ ختم ہو گیا۔''

قدرت اللہ شہاب صاحب ''شہاب نامے'' کے آخری باب ''چھوٹا منہ بڑی

بات‘‘ میں لکھتے ہیں کہ ایک رات بستر پر لیٹے ہوئے وہ مراقبہ ٔ موت کی مشق کر رہے تھے اچانک انھیں محسوس ہوا کہ ان کا جسم فوم کے گدے اور چارپائی کی ٹھوس لکڑی سے گزر کر نیچے فرش کے ساتھ جالگا ہے۔ انھوں نے گھبرا کر اٹھ کر دیکھا تو چارپائی پر ان کا اپنا وجود بھی بدستور لیٹا پڑا تھا۔

چارپائی کے اوپر جسم عنصری تھا اور پلنگ کی تہ سے گزر کر نیچے جانے والا جسم مثالی تھا جسے Astral body بھی کہتے ہیں۔

RekhtaDownload.com

ایک جرمن سرجن کی روح

RekhtaDownload.com

اس واقعہ کی تفصیلات انگریزی کے مشہور میگزین Readers Digest میں رپورٹ ہو چکی ہیں۔

اس کا نام آریگو تھا۔ وہ برازیل میں 1918ء میں پیدا ہوا۔ جب یہ سکول میں پڑھتا تھا تو وہ عجیب قسم کی hallucinations کا شکار ہوتا۔ کبھی غائب سے آواز آتی، کبھی تیز روشنی نظر آتی۔ آواز کی زبان اس کی سمجھ میں نہ آتی جیسے غیر ملکی زبان بولی جا رہی ہو۔

جب آریگو جوان ہوا تو اس نے لوہے کی کانوں میں ملازمت کر لی۔ اس میں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جس سے وہ ہر دل عزیز ہو گیا اور وہاں کی یونین کا صدر منتخب ہو گیا۔

رات کو وہ اکثر ایک ہی طرح کا خواب دیکھتا۔ جس میں ایک گنجا ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹروں اور نرسوں کے ساتھ آپریشن روم میں آپریشن کر رہا ہوتا اور انھیں غیر ملکی زبان میں لیکچر دے رہا ہوتا۔ یہ وہی زبان تھی جسے وہ بچپن میں سنا کرتا تھا۔ خواب کے بعد آریگو پریشان ہو جاتا اور اسے سخت سر درد محسوس ہوتی۔

ایک رات اس گنجے ڈاکٹر نے خواب میں اپنا تعارف کر دیا۔ اس نے اپنا نام

ڈاکٹر فریٹز بتایا۔ وہ ایک جرمن سرجن تھا اور پہلی جنگ عظیم میں مر گیا تھا۔ اسے اپنے مارے جانے پر اپنا کام ادھورا چھوڑنے کا سخت افسوس تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ آریگو ایک ہمدرد انسان ہے تو اس نے اپنے ادھورے کام کی تکمیل کے لیے اس کو چن لیا جس کے ذریعے سے اب وہ دکھی بیمار لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے بے چین تھا۔

آریگو کو ان خوابوں اور فریٹز کے پریشر نے بہت عرصہ تک تنگ کیے رکھا۔ آخر بات اس کے اپنے بس میں نہ رہی۔

1950ء میں ایک اعلیٰ عہدے دار لوسیو لوہے کی کانوں کے مزدوروں کے حالات کو بہتر بنانے کی سٹڈی کے لیے آریگو کے شہر آیا۔ لوسیو کو lung cancer تھا جس کا آریگو کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

لوسیو رات کو سونے لگا تو اس نے دیکھا کہ آریگو ہاتھ میں استرا لیے داخل ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک اور ہمدردی تھی۔ پھر اس نے جرمن زبان بولنی شروع کر دی۔ عجیب بات یہ کہ لوسیو کو بالکل ڈر نہ لگا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

لوسیو کو جب ہوش آئی تو اس نے اپنے کپڑے اترے دیکھے جن پر خون لگا ہوا تھا۔ پھر اس نے اپنے جسم پر پسلیوں کے ساتھ ایک صاف ستھرا چیرا دیکھا۔ کپڑے پہن کر وہ آریگو کے کمرے میں آیا تو وہ صاف مکر گیا کہ اس نے اس کا آپریشن کیا ہے۔ آریگو کو کچھ یاد نہ تھا۔

لوسیو فوراً امریکن ڈاکٹروں کے پاس گیا تو انھوں نے تفصیلی ملاحظے کے بعد کہا کہ اس کے کینسر کا بہترین آپریشن ہوا ہے۔ جب ان کو بتایا گیا کہ یہ سب کس نے اور کیسے کیا ہے تو ان کو یقین نہ آیا۔ یہ بات لوگوں میں پھیل گئی اور برازیل کے سارے اخبارات نے سرخیوں میں اس کا ذکر کیا۔

وہاں کے پادری نے آریگو کو وارن کیا لیکن لوگوں کی بڑی تعداد ان کے پاس آنے لگی۔ ہجوم بڑھتا گیا تو آریگو کو اپنا کام کرنے کے لیے ایک خالی چرچ میں شفٹ ہونا پڑا۔ چھ

سال میں اس نے ہزاروں لوگوں کا علاج کیا۔

1956ء میں وہاں کے ڈاکٹر اور پادری اس کے خلاف ہو چکے تھے۔ انھوں نے آخر یہ الزام لگا دیا کہ یہ شخص ان پڑھ ہوتے ہوئے آپریشن کر رہا ہے۔ اس کو گرفتار کر کے جج کے سامنے پیش کیا گیا۔

جج نے سوال کیا:

''تم پریکٹس کیسے کرتے ہو؟''

آریگو نے جواب دیا:

''اللہ کا نام لے کر شروع کر دیتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کیا کر رہا ہوں۔ کسی چیز کی ہوش نہیں رہتی۔''

جج نے کہا:

''یہی تو تمہارے خلاف الزام ہے کہ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی تم آپریشن کرتے ہو۔''

آریگو نے کہا:

''جناب میں کب آپریشن کرتا ہوں، وہ تو ڈاکٹر فریٹز کرتا ہے۔''

جج نے پندرہ ماہ کی قید سنا دی۔ لوگوں میں وہ بہت ہر دل عزیز ہو چکا تھا۔ قید آٹھ ماہ کر دی گئی لیکن اس کی پریکٹس بند کر دی گئی۔ اسے سر درد پھر شروع ہو گئی۔

پولیس والوں نے در پردہ اس کی مدد کی اور وہ جیل میں بھی لوگوں کا علاج کرتا رہا۔ اس کی شہرت کے چرچے امریکہ تک پہنچے۔

1963ء میں امریکہ سے ڈاکٹر پوہارچ تفتیش کے لیے خود پہنچا۔

ڈاکٹر پوہارچ دیکھ رہا تھا کہ ایک بوڑھا آدمی آیا۔ آریگو نے اس کو دیوار کے ساتھ لگا کر چار انچ لمبا چاقو اس کی آنکھ میں چبھو کر کھرچنے لگا۔ مریض کو کوئی anesthesia نہیں

دیا تھا مگر اسے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد چاقو کو آنکھ سے نکالا تو خون اور پیپ سے بھرا ہوا تھا۔ اس کو اس نے اپنی قمیض سے صاف کیا اور اگلے مریض کو بلا بھیجا۔

کوئی صفائی نہیں، کوئی anesthesia نہیں۔ کام کرتے وقت جرمن بولتا اور اس کا لہجہ تبدیل ہو جاتا۔

پر ایک بات تھی، اس نے مریضوں سے کبھی فیس یا پیسے یا تحفہ نہیں لیا تھا۔ سب کام مفت کرتا۔

1964ء میں لوکل ڈاکٹر پھر خلاف ہو گئے۔ شکایتیں کیں اور آریگو کو پھر 16 ماہ کی قید ہو گئی۔

پولیس نے اسے جیل بھیجنے سے انکار کر دیا۔ وہ خود جیل چلا گیا۔ گارڈز اس سے محبت کرتے، اس کی عزت کرتے اور اس نے جیل میں مریضوں کا علاج شروع کر دیا۔ آخر 1965ء میں وہ پھر رہا ہو گیا۔

امریکن ڈاکٹر نے امریکہ میں آکر شور مچایا کہ یہ کیا معجزہ ہو رہا ہے۔ ادھر مختلف میڈیکل سوسائٹیوں نے آریگو کی طرف رخ کیا۔ دنیا بھر کے صحافی مووی کیمرے لے کر پہنچ گئے۔

سب ٹیمیں اکٹھی ہو گئیں۔

سب تفتیشی ڈاکٹروں نے اتفاق کیا کہ:

"اس کی تشخیص ماہر ڈاکٹر کی طرح تھی۔ اس کے نسخے بہترین تھے۔ اور سرجری میں وہ قابل ترین سرجن سے بھی بہتر تھا۔"

آخر 1971ء میں آریگو کار کے ایکسڈنٹ میں مر گیا۔

قدرت اللہ شہاب صاحب کا بیان کردہ واقعہ اور برازیل میں آریگو کی certified داستان جان کر سر پکڑ کر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا روحیں اس طرح مداخلت کر سکتی ہیں؟

علامہ اقبالؒ سے مرزا غالب اور مولانا روم کی ملاقات

جسٹس جاوید اقبال نے اپنے محترم والد علامہ اقبال سے متعلق مفصل کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ''زندہ رود''۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ مارچ 1938ء میں بیماری کی وجہ سے علامہ اقبال کی حالت تشویش انگیز ہوتی چلی گئی۔

دمے کے دورے پڑتے تھے۔ شانے اور کمر کا درد بدستور تھا۔ قلب، گردے اور جگر سب ماؤف ہو چکے تھے۔ نیند آتی نہ تھی اور مسلسل بے خوابی کا عالم طاری تھا۔ وقت کاٹنا مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جارہا تھا۔ بعض اوقات کھانستے کھانستے غشی کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ایک دفعہ تو بے خبری میں پلنگ سے فرش پر گر گئے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ انہی ایام میں بے ہوشی کے عالم میں انہوں نے خود دو مرتبہ اپنی خواب گاہ میں مرزا اسد اللہ خاں غالب اور مولانا جلال الدین رومی سے باتیں کرتے سنا تھا۔ دوسری مرتبہ علامہ اقبال نے اپنے ملازم علی بخش کو بلوا کر پوچھا کہ میرزا غالب (یا رومی) ابھی اٹھ کر گئے ہیں۔ دیکھنا کہیں چلے تو نہیں گئے اور علی بخش کے اس جواب پر کہ یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا، فرمایا: چلو ٹھیک ہے۔

Mediums

Mediums ان کو کہتے ہیں جو trance میں جا کر روحوں کو بلا لیتے ہیں۔ ان کے رشتے داروں یا دوستوں کے سوالات کا جواب لے دیتے ہیں۔

میرے ایک پی آئی اے میں اعلیٰ عہدے پر فائز دوست کی بیوی نے جو خود پڑھی لکھی خاتون ہیں نے بتایا کہ لندن میں وہ اپنی کزن کے ساتھ ایک میڈیم کو ملنے گئی۔ اس کی کزن نے اپنے والد کی روح کو بلانے کے لیے کہا۔ کچھ دیر Trance میں جانے کے بعد میڈیم بولی۔

''آپ کے والد آ گئے ہیں۔ فوجی وردی میں ملبوس ہیں، کہہ رہے ہیں کہ تم فکر نہ کرو۔''

اس کی کزن کے والد فوج میں جنرل تھے۔ یہ سچ تھا۔

1994ء میں مجھے سکاٹ لینڈ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک چالیس سالہ کمپیوٹر designer کے ساتھ اچھی جان پہچان ہوگئی۔ کبھی مل جاتا تو ہلکی پھلکی گپ شپ ہو جاتی۔

ایک دن میں اس سے پوچھ بیٹھا کہ آپ لوگ مذہب سے دور کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟

وہ کہنے لگا۔ ''مذہب تو پرانی بات ہو چکی ہے۔ آپ نے فلاں فلاں کتاب نہیں پڑھی؟''

اس نے دس کتابوں کے نام لے دیئے۔ پھر وہ re-incornation اور روحوں کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے بہت سمجھایا کہ یہ سب بکواس ہے۔ تم بائبل پڑھو۔ پرانے Fathers سے بات کرو۔ مگر وہ اپنے نئے belief پر اڑا رہا۔

پاکستان آنے کے دو ماہ بعد مجھے ایک بڑا پیکٹ ملا جسے کھولنے پر مجھے امریکہ اور یورپ میں لکھی گئی آٹھ دس کتابیں ملیں۔ یہ پیکٹ میرے سکاٹ لینڈ والے دوست نے بھیجا تھا۔ کتابوں کی قیمت 120 پاؤنڈ سے زیادہ تھی جو اس نے اپنا پوائنٹ ثابت کرنے کے لیے اپنی جیب سے خرچے۔

ان کتابوں میں re-incornation موت کے بعد واپسی، mediums اور Spiritual Healers کی داستانیں تھیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ آج کل مغرب کی دنیا میں بڑے وسیع پیمانے پر ان علوم کا پرچار ہو رہا ہے۔ دھوکے بازوں، فریبیوں اور ڈھونگیوں نے روحوں سے ملاقات وغیرہ کا کاروبار بڑے زور و شور سے شروع کر رکھا ہے۔

Rekhtadownload.com

روحوں کی باتوں کی حقیقت

روحوں سے متعلق جو کسی نے لکھا یا کہا میں نے وہ بیان تو کر دیا مگر میرا اس معالے میں اپنا علم صفر سے بھی کم ہے۔

میرے دو دوست ہیں، ایم اے پی ایچ ڈی تک پڑھے ہوئے۔ انھوں نے اپنے آپ کو قرآن پاک کی تحقیق کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ وہ روایتی مولوی قسم کے لوگ نہیں ہیں بلکہ بہت کھلا ذہن رکھتے ہیں۔

میں نے ان کے ساتھ میٹنگ arrange کی اور یہ تمام باتیں جو لکھی ہیں، ان کو پڑھوا دیں۔ پھر ان کو پوچھا کہ کیا آپ یقین کرتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے؟

''دونوں نے agree کیا اور کہا:

''ہاں، ہو سکتا ہے۔''

مگر ساتھ ہی دونوں کی متفقہ رائے تھی کہ مرنے کے بعد روح عالم برزخ سے واپس نہیں آسکتی۔

''تو پھر یہ کون کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

کہنے لگے انسان کا اپنا mind بہت powerful چیز ہے۔ اس کے کئی گوشے

ہیں، وہ خود کوئی کام کر کے تصور میں کسی اور کو ذمہ دار ٹھہرا لیتا ہے۔ دوسرے کا mind پڑھ کر اسی کے مطابق کسی پر حاوی ہونا تو بہت آسان ہے۔ پچھلے دنوں اخبار میں آیا تھا کہ کسی نے لوگوں کے سامنے ان کی نظروں سے تاج محل کو چند لمحات کے لیے گم کر دیا۔ دوسری نئی بات انھوں نے یہ بتائی کہ یہ کارستانی جنوں کی ہو سکتی ہے۔ جن اچھے بھی ہوتے ہیں برے بھی ہوتے ہیں۔ وہ کسی سے associate ہو جائیں تو خوشبوئیں بھی آتی ہیں۔ ڈاکٹر فریٹز کا روپ دھار کر آپریشن بھی کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم guidance صرف اور صرف قرآنِ پاک سے لیتے ہیں۔

میرے اپنے ذہن میں یہی ہے کہ guidance قرآنِ پاک سے ہی حاصل کرنی چاہیے۔

روحوں کا علم صرف اللہ پاک کو ہی ہے۔ اس علم کو وہی جانے، شاید میرے دوست بھی نہ جانتے ہوں۔

RekhtaDownload.com

ممتاز مفتی سے دوستی - ممتاز مفتی سے خط و کتابت - انوکھے عشق
اور بوڑھوں کا رومانس - اس حسن کو کیا کہیے - اے آر رحمان -
علم نجوم - روحوں کی باتیں - پامسٹری - روحوں کی حقیقت -
Nostradamis - علامہ اقبال سے مرزا غالب اور
مولانا روم کی ملاقات

آپ ہی اس کتاب کو پڑھ کر اندازہ لگا لیجئے کہ مراسلہ نگاری، مافوق الفطرت واقعات اور حیرت کا عجب باب کھولے یہ کتاب آپکی منتظر ہے اور مستزاد یہ کہ مظہر سعید قریشی کا انداز تحریر کچھ ایسا ہے کہ بار ہا توجہ مفتی جی سے ہٹ کر صرف مظہر کی ذات پر مرکوز ہو جاتی ہے یہ معاملہ بھی عجیب ہے!

دعاؤں کے ساتھ
بانو قدسیہ
داستان سرائے

جب میں نے مظہر سعید کی کتاب "انوکھے سچ" شروع کی تو اسے ختم کیے بغیر نہ چھوڑ سکا۔ "انوکھے سچ" آپ بھی ایک ہی نشست میں ختم کر دیں گے۔

احمد بشیر

Rs. 180.00

www.sang-e-meel.com
ISBN 969-35-1296-0
9789693512960